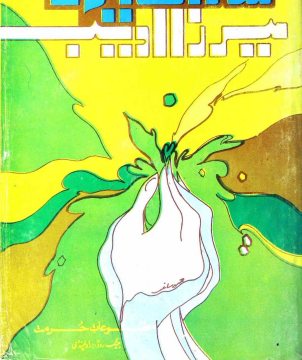


سازمان جریان

پیرزادان



چاپ و نشر سازمان جریان

تیرماه ۱۳۵۷



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



ساتواں چراغ

میرزا ادیب

مطبوعہ عارف حُرمت
ملک روڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	_____	ساتواں چراغ
مصنف	_____	محمد ارب
طبع اول	_____	۱۹۸۳ء
تعداد	_____	ایک ہزار
مطبع	_____	خورشید پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	_____	زاہد ملک
قیمت	_____	۴۰ روپے

تَرْتِیب

۹	امانت
۳۷	ساتواں چہرہ
۵۱	تحریرت میں
۶۲	سائزہ
۷۲	ہندگی، بڑا مسند
۹۷	ریڑھی
۱۰۰	عنایت بی بی کا افضال
۱۲۱	درویش
۱۲۸	کافہ کی ناؤ
۱۶۳	علیا کی فنی
۱۷۷	اس کی خاطر
۱۹۷	ایک منزل، کئی راہیں

میش لفظ

میرزا ادیب کی شخصیت اور فن کے کئی پہلو ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ اور کالم نگاری میں انہوں نے اردو ادب کی گراں بہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ اور اپنی زندہ شرح، متحرک ذہن اور وسیع تخیل کے ساتھ ادب کی دنیا میں گراں بہا اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے بہت سی اصنافِ سخن کی روایات کو آگے بڑھایا ہے اور انہیں وسعت، گہرائی اور تازگی سے آشنا کر لیا ہے۔

میرزا ادیب کے اکثر افسانوں میں زندگی کی چھائی اور فن کے خلوص کی تاثیر نظر آتی ہے۔ ان کے ان زندگی اور فن میں باہمی ربط کچھ یوں قسما ہے کہ افسانہ اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں افسانہ کو دلکش بناتی ہیں، اُدھر افسانہ مثبت قدروں کی ترویج کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہ جیتے جاگتے کرداروں اور معاشرتی قدروں کا خوبصورت چرچانے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اہم چیز زندگی سے وابستگی ہے۔ جس معاشرے کا وہ عکس پیش کرتے ہیں، وہ ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر مجرم سے "ساتواں چراغ" کے کم و بیش تمام افسانے زندگی اور فن کے حسین امتزاج کا خوبصورت مرقع ہیں۔ تاہم "امانت"، "زیرِ طحی"، "بندِ گل کا سلسلہ"، "عنایتِ بی بی کا افضال" میں ہیں زندگی کی حقیقتیں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دھڑکتی نظر آتی ہیں۔

میرزا ادیب کے افسانوں کا پس منظر، انسانی فطرت اور معاشرتی زندگی کے ایسے مظاہر ہیں جو صرف گہرے مشاہدے سے فنکار کے تجربے کا جزو بن سکتے ہیں۔ ایک دو افسانوں سے قطع نظر، انہوں نے اپنی کہانیوں میں خیالی یا تصوراتی دنیا بنانے کی بجائے محسوس اور

زندہ حقیقتوں سے سروکار رکھا ہے۔ اور ان حقیقتوں کا اور انہوں نے اپنے عہد کے معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ وہ صرف ان حقائق کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ جن سے ان کا تریقی تعلق ہوتا ہے۔ اور جن کا مشاہدہ انہوں نے قریب سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے افسانے "سازہ" نظیا کی ٹلی" اور "کاغذ کی ناؤ" فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اور حقیقتوں کے اور ان میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ "سازہ" میں "سازہ" اور بڑے میاں دونوں مصیبت آمیز جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مگر معصومیت کا یہ عالم ہے کہ دونوں پر بے اختیار پیار آنے لگتا ہے۔

میرزا صاحب نے متوسط گھرانوں کے ماحول اور مسائل سے جہیں روشناس کر لیا ہے اور اپنے چرخیے والوں میں یہ احساس پیدا کیا ہے۔ کہ ان گھرانوں میں مسائل لینے والی زندگی میں تنوع بھی ہے اور یکسانی بھی۔ اس میں معاشرت، اخلاق اور رومان کے بے شمار مظاہر اور عکس موجود ہیں اس ماحول میں انہوں نے حسرت و یاس کے مرقعے تلاش کئے ہیں اور ان میں اپنے دل کی ٹپ ٹپ اور درد و غم کی تاثیر شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا مونس و غمخوار بنایا ہے۔ ان کے افسانے جہاں ایک طرف متوسط طبقے کی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مبصرانہ مرقعے ہیں۔ وہاں دوسری طرف فن کے حسن و جمال اور بحر کاری کے دل نشیں نمونے بھی ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں میں ایسے موضوع نکال لیتے ہیں جنہیں دوسرے غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی موضوع میں فطرت انسانی کے ایسے مظاہر دیکھتے ہیں کہ زندگی کی معمولی سی حقیقت بھی بڑی اہم معلوم ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی ایسا نہیں جس میں اچھے افسانے کے امکانات پوشیدہ نہ ہوں۔ موضوع کے انتخاب میں سمجھ ان کے یہاں بڑا تنوع ہے۔ ان کا موضوع ایک ہی وقت میں فرد بھی ہے اور معاشرہ بھی۔ داخلی کیفیتیں بھی ہیں اور خارجی مظاہر بھی۔ "گریٹ مین" اس کی خاطر درویشی چند ایسے افسانے ہیں جو قاری کے ذہن پر لازوال تاثر مرتب کرتے ہیں۔

کہ دراز نگاری کے فن میں بھی میرزا صاحب کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے

اپنے کرداروں کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی باریک بینی اور شدت سے کیا ہے اور اس مشاہدے سے بڑھ کر
 کے بھرائی میں سے ہر ایک کو اپنے تختہ عمل میں بسایا اور فکر سے نکھارا اور اونچا کیا ہے۔ انہوں نے
 عموماً روایت اور حدیث کو پوری طرح ہم آہنگ کرنے کو اپنا فنی مسلک بنایا ہے۔ ان کے
 افسانوں میں حدیث اور روایت دونوں کے ٹوٹاؤ سے بچتے ہیں۔ دونوں کو حیات الہی حقیقی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔
 میرزا ادیب پوری کو کشش سے اپنی بات کے اظہار کے لئے اچھے سے اچھا اسلوب تلاش
 کرتے ہیں۔ مشاہدہ میں وہ جزئیات کی جستجو میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا فنی ان کی
 شخصیت کے انفرادی اور امتیازی عناصر کے رچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کے
 منظر و فکر کی تخلیقی، جذباتی انداز اور موضوع و فن میں پوری طرح فکری ہم آہنگی نظر آتی ہے۔
 ”ایک منزل کئی راستے“ ان کا شاہکار افسانہ ہے اور فنی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔
 ان کا اسلوب حد درجہ شگفتہ ہے اور رومانیت کی بجلی سی چاشنی تحریر کا لطف دو بلا کوئی
 ہے۔ افسانہ ”گریٹ میں“ میں نوراں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

”شاید وہ (نوراں) اس تاریکی میں کسی ایسی کڑی کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے
 راستے دل میں اتر جائے“

”اپنے افسانے ”سارہ“ میں بوشے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

”نہ تو طلوع آفتاب سے پہلے جہاں توہاں بکھرے جگمگی اُجاڑوں سے اسے کوئی
 دلچسپی تھی نہ غروب آفتاب کے بعد بلندیوں سے اُگرتے ہوئے شفق آلودہ صندھوں کو وہ
 پر شوق نظروں سے دیکھتا تھا۔“

ایک اور افسانے ”ایک منزل، کئی راستے“ میں اُٹی کے قلم کی جھولانیاں ملاحظہ ہوں:
 ”لاشد نے کسی پر بیٹھ کر مریضہ کی طرف غور سے دیکھا۔ لڑکی کیا تھی۔ سنگ مرمر سے
 تراشی ہوئی ایک گرٹیا تھی۔ سیاہ زلفیں رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ
 سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔“

”کاغذ کی ناؤ“ میں سے ایک آفتاب ملاحظہ فرمائیے :

”نصیر خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ ایک لرزش خفی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جھبکی ہوئی تھیں اور بچکوں پر سائے سے لڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔“

مرزا ادیب کے ہاں لگا ہے لگا ہے پراسرار قسم کے کرداروں سے بھی پالا پڑتا ہے۔ افسانہ ”ساتواں چراغ“ میں ہم اس قسم کی عبارت سے دوچار ہوتے ہیں :

”بابہ نرینہ جمعرات کو جب اس نے چراغ جلا کر مزار سکے پہلو میں رکھا اور مدھم مدھم روشنی میں دکھا کے لئے ہاتھ پھیلانے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اور اس احساس کے باوجود اس کے منم آلود ہونٹ جلتے رہے۔“

”دونوں ہاتھ پھیر کر وہ مڑی۔ اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا جہر دکھائی دینے لگا۔ جس کے گرد دوپٹہ پٹا ہوا تھا۔“

میرزا ادیب نے روایت، مشاہدہ، تخیل اور قصور کی دکھائی ہوئی روشنی میں نئے نئے جہاں آباد کئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ساتھ ایک ربط اور تعلق پیدا کرنے کی جو نمایاں خواہش ہے۔ وہ ان کے افسانوں کے عنوان اور موضوع کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ ان کے ہر افسانے میں قدم قدم پر زندگی کی جھلکارسنائی دیتی ہے۔ ان افسانوں کے دامن میں آنسوؤں کے موتیوں کی بھی وہی کثرت ہے جو مسرت و شادمانی کے پھولوں کی۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ہر جگہ سے جگے تنفس کی جھلکارسنائی دیتی ہے۔ انہوں نے انسان کے دل میں جھانک کر اس کے ہر چھوٹے بڑے راز کی عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں میں مشاہدہ، احساس اور فکر کی مکمل جہم آہنگی موجود

ہے۔ فنی انہماک اور توجہ کے ساتھ ساتھ بیان کی لطیف شعریت کا بڑا صحیح امتزاج ہے۔ ان کی مصوٰی میں فکر کی گہرائی، تخیل کی رنگینی اور موضوع کی سادگی اور نزاکت پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

کرنل غلام سرور (ستارہ امتیاز (ملٹری)

امانت

دھرم کے آخری ہتے میں بیٹکوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ شاف کو سات سات آٹھ آٹھ بجے تک معلوم کار رہنا پڑتا ہے اور ضمیر احمد تو بنگ کار پانچ بجے تھا اس کے عہدے کا اتنا مٹا تھا کہ اپنے شاف کے ساتھ بیٹھے اور ہر کام اپنی ٹکرانی میں کر لے۔ اس کی بیوی رضیہ کو اس کا بخوبی علم تھا۔ تاہم وہ پانچ بجے ہی شوہر کو ٹیلیفون کر کے جلدی آنے کی تاکید کر دیتی تھی کہ بچے اس کے آنے سے پہلے سو نہ جائیں۔ بچے پانچ بجے سے باپ کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ اس روز بھی رضیہ نے یہ جہنم کے باوجود کہ اس کے شوہر کا جواب کیا ہو گا اس سے آنے کا وقت پوچھ لیا۔

”بھئی جلدی کیونکر آسکتا ہوں؟ بے پناہ کام ہے۔ آج تو نو بجے آنا بھی بڑا مشکل ہے۔“
ضمیر نے یہ اطلاع دے کر بیوی کو بالوں کر دیا۔ رضیہ ریسور رکھنے ہی والی تھی کہ ضمیر نے پوچھا،
”آج کی کوئی خاص خبر؟“

”خبریں کیا ہوں گی؟ بچے بار بار پوچھتے ہیں ابو کب آئیں گے۔ اور تو کوئی خبر نہیں۔ ڈاک سے تین خط آئے ہیں۔“

”کس کس کا ہے؟“

”ایک کا ہیڈ رائٹنگ ترمیم پانچ ہوں۔ آپ کے مہمانی جان کا ہے۔ دوسرے میں دو کاغذ کار غالب اہل ہو گا۔ پرسوں شاپنگ کی تھی نا؟ اور یہ لفافے کے کونے میں الطاف احمد لکھا ہے۔“
معلوم نہیں یہ صاحب کون ہیں۔

”خط کہاں ہے الطاف احمدا کا؟“

رضیہ اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، بولی، کیا اس میں کوئی بہت بڑا راز ہے؟ اس کی پیشانی ٹھکن آؤد ہو گئی تھی۔

”نہیں اس میں کوئی راز نہیں۔۔۔ البتہ اس سے ایک کہانی وابستہ ہے؟“ ضمیر نے کہا اور یہودی کے افسانوں کی طرف اس موقع سے دیکھنے لگا کہ ابھی یہ خط اسے مل جائے گا، مگر یہ دونوں ہاتھ خالی تھے۔

”خط؟ رضیہ؟“

خط آپ کے نام ہے۔ آپ ہی کو ملے گا، لیکن آج یہ آپ کا دن ہے اس میں کچھ سمجھ نہیں سکتی۔ رضیہ نے سر کو جھٹکا دے کر مانتے پتا جانے والی لٹ کر چھپے بیٹایا اور رضیہ کو غور سے دیکھتا ضمیر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ مسدست کے انداز میں کہا، رضیہ! بھئی.....“

کہہ تو رہا ہے، خط آپ کا ہے میں کون جانتی ہوں اس کے بارے میں پوچھنے والی۔۔۔ یہ بچھنے۔ اور رضیہ نے میز پر سے خلیفہ نواز کھڑی ہٹا کر تینوں خط اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیئے اور خود چپ چاپ ایک طرف کھڑی رہی۔

رضیہ! ضمیر نے جیندگی کے ساتھ کہنا شروع کیا جیسے سیز کے کردار پولٹ نے اپنے فلسفی درست سے کہا تھا کہ اس آسمان اور زمین میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا ذکر تہذیبی فلسفے میں نہیں ملتا کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ریٹا برہمی معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی جہد میں انسانی دل کے کچھ بڑے گہرے راز چھپے ہوتے ہیں۔

رضیہ نے اس خیال سے کہ اس کے شوہر نے اس کی سکو لہٹ کا بڑا انا ہے، درحقی صورت بنائی اور شوہر سے مخاطب ہو کر بولی آ

”آپ درست کہتے ہیں، بہر حال کھانا کھا لیتے؟“

سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ رضیہ جب بھی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی تھی، اس کے چہرے پر ایک اندرونی اضطراب کے واضح اثرات نظر آجاتے تھے۔

ضمیر کھانے کے بعد دو تین سگریٹ پیتا تھا۔ بچوں سے دن بھر کی دوادوستا تھا اور پھر انہیں کچھ پیٹنے لے کر ہنسا بھی تھا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا، لیکن اس وقت وہ کچھ کہے بغیر اٹھا اور اوپر کے کمرے میں جانے کے لئے سیز چھیلنے لگا۔ اوپر اس کا خاص کمرہ تھا جس میں اس کا ذاتی سامان ترتیب دیا گیا تھا۔

بچوں کے اندازہ لگا چکے تھے کہ آج کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ وہ چند منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ماں نے انہیں اپنے اپنے بستر پر چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔

رضیہ نے یونہی ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی مدق گردانی کرنے لگی۔ آدھ گھنٹہ بیتا، ایک گھنٹہ گزر گیا، بغیر خواب گاہ میں نہ آیا۔

”یہ اوپر کیا کر رہے ہیں؟“ رضیہ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک مہم می پریشانی اس کے دماغ میں ریچنے لگی تھی۔

”رضیہ! اوپر سے آواز آئی۔“

”جی“

”ذرا اوپر آؤ؟“

اس نے کمرے کے اندر قدم رکھا، قویہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرے میں جتنے سوٹ کیمس تھے ان سب کے کپڑے باہر کھینچے پڑے تھے اور باوجودیکہ وہ دبیر کا مہینہ تھا، ضمیر جیسے میں شرا اور دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟“ رضیہ نے سوال کیا۔

”میرا کوئی ٹانگ نیچے تو نہیں؟“ ضمیر نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے استفسار کیا۔

”نہیں تو۔۔۔ یہی چار سوٹ کیس ہیں آپ کے۔“

”ایک ٹرنک بھی تھا۔ پرانا، کلمے رنگ کا۔ وہ کہاں ہے؟ کیا تم کو خبر نہیں وہ ٹرنک میرا ہے۔ اس میں میں نے اپنے کچھ کپڑے رکھے تھے۔ کہاں ہے وہ؟“
رضیہ کچھ سوچنے لگی۔

”بتائی کیوں نہیں ہو۔؟“

رضیہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: پرانے مکان سے اس مکان میں آنے، تو کچھ بے کار چیزیں اور دھڑ دھڑ بانٹ دی تھیں۔

”اور دھڑ دھڑ بانٹ دی تھیں، کیا مطلب؟“

”پرانی اور بے کار چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ مکان میں ان کی گنجائش بھی کہاں تھی؟ میں پوچھتا ہوں۔۔۔ میرا وہ ٹرنک کہاں ہے؟“

ضمیر عام طور پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا تھا۔ لہذا واہ سے بولنا اس نے کبھی مناسب نہیں سمجھا تھا، مگر آج جیسے ساری احتیاطوں کا واسن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کہاں ہے وہ ٹرنک؟ وہ دوبارہ مگر جا۔

رضیہ نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ اس میں سے نئے کپڑے نکال لئے تھے۔

”اور وہ کیل؟“

”ٹرنک پر آغ لی بی کے حوالے کر دیا تھا۔“

”اس میں کیل بھی تھا؟“

اب رضیہ کے سمجھ میں بھی کسی قدر خشکی در آئی۔ تجھے کیا پتہ تھا کہ یہ پرانا کیل آپ کو اس

قد خریدے میں نے اسے بے کار سمجھا تھا۔ بتا دیا ہوتا، تو میں سینے سے لگا کر رکھتی۔

ضمیر نے تیر نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ جب میں نے اسے اپنے ٹرنک میں محفوظ کر رکھا تھا،

تو یہ بری بہ مذاقی نہیں تھی۔ غصہ فدا دی چیز کی جاتی ہے جس کی ضرورت ہو تم مجھ سے پہنچ نہیں
سکتی تھیں؟

آپ بھی تو کمال کرتے ہیں! رضیہ کی تہا از بھی بلند ہو گئی تھی۔

کیا کمال کرتا ہوں؟

ایک پرانی بے کار شے بڑی تھی جسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا میں نے ہی سوچا کہ گھر میں
بے کار جو پڑی ہے، تو کبھی غریب ہی کے کام آجائے۔ اس لئے دوسرے پھنے پرانے کپڑوں کے
ساتھ اسے بھی نوکرانی کو دے دیا۔ کیا میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا؟ پہلے کوئی کپڑا آپ
سے پہچے بغیر نوکرانی یا کسی اور کو نہیں دیا تھا! اس مرتبہ خاص طور پر آپ سے پہچھے کی کیا
ضرورت تھی؟

ضمیر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رضیہ بیڑھیوں کی طرف جانے لگی۔

”سنو! مجھے یہ کبھل واپس ملنا چاہیے؟“ ضمیر نے ٹھکانا لیجھے میں کہا۔

رضیہ نے ایک لمحے کے لئے رک کر اپنے خوبرو کو دیکھا۔ وہ پوری بخندگی سے یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔
وہ نیچے اترنے لگی۔ ایک ایک بیڑھی پر رکتی ہوئی ضمیر کا آخری فقرہ ایک کائنات کی طرح اس
کے ذہن میں چھینے لگا تھا یہ نہیں کو خیرہ برس کی از دو باہی زندگی میں خوبرو کے ساتھ اس کے اختلافات
نہیں ہونے تھے۔ کئی بار ہونے تھے اور تلخ کلامی کی وجہ سے انہوں نے کئی کئی روز تک ایک
دوسرے سے گفتگو بھی نہیں کی تھی، مگر اس سے پہلے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کے
درمیان جگہ آکسی سطحی سی بات پر ہوا ہے اور اس بار تو وہ خوبرو کی اس ناقابل برداشت زیادتی کی
وجہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک پرانا کبیل کسی کدوے دیا۔ اس میں میں نے جرم کیا کیا ہے؟ یہ سوال اس کے دل و دماغ
پر کچھ کے نگاہ مل تھا۔

وہ نیچے آئی، بچوں کی خواہ گاہ میں جا تک کر دیکھا، کمرے کا لیب جل رہا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی

اس نے جی بھجادی۔ کمرے کے باہر صحن کی جی روغن تھی اور یہ جی ساری رات جلتی رہتی تھی۔ وہ اس جی کے نیچے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں کافی سڑی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھوکے چل رہے تھے مگر نہ جانے اسے اپنے اندر ایک ہزار کن پش کیوں غسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اپنے شوہر کے رویے پر غور کرتی جاتی تھی۔ یہ پش بڑھتی جاتی تھی۔

اب وہ اوپر کیا کر رہے ہیں؟ اچانک اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا آیا۔ کیا پھر مسلمان کو آٹ پلٹ کر رہے ہیں؟

اس کے اندر ایک خواہش نے سراٹھایا کہ اوپر جا کر دیکھے اور وہ اس خواہش کو ضبط نہ کر سکی۔ کمرے سے روٹنی باہر آ رہی تھی اور اس کو نے میں جہاں تو آدم سیف پڑا تھا۔ اس کا شوہر کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سیف پر رکھا ہوا تھا۔ رخ دیوار کی طرف تھا۔ اس نے فرخ فرش پر نظر ڈالی، رضیہ اند آجا؟

رضیہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ انہیں اس کی موجودگی کا علم کیونکر ہو گیا ہے۔
آجا ڈرضیہ؟

ضمیر نے دوبارہ کہا اور جب رضیہ نے اندر قدم رکھا، تو اس نے فرش پر اپنا سایہ بکھو لیا۔ وہ اب بھی کہ جب وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی، تو اس کا سایہ اندر فرش پر پھیل گیا تھا۔ ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گز رہی ہے۔ غالباً میرا دیر تمہارے لئے ایک تھا بن گیا ہے؟
غالباً نہیں یقیناً۔ رضیہ نے شوہر کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

بیٹھ جاؤ اور یہ کہہ کر اس نے بیوی کو اس آرام کرسی میں بٹھا دیا جس میں بیٹھ کر وہ چھٹی کے دن کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتا تھا۔ اس نے دوسری کرسی آرام کرسی کے برابر کھسکالی اور خود اس میں وضو کیا، رضیہ! میں نے تم سے کہا ہے کہ اس لٹافے کے ساتھ ایک کہانی دابستہ ہے اور یہ کہانی میں تمہیں سنائے دیتا ہوں۔ سنو گی؟

رضیہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اس نے کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
 ”کم و بیش تمیں برس گزرے میں ایک ہوشل کے کمرے میں اپنے بچپن کے دوست نواز احمد
 کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس محبت کی ایک بڑی
 وجہ یہی کھل تھا۔“
 ”کھل؟“

”ہاں کھل۔ ہم دونوں غریب والدین کے بیٹے تھے بشکل سے گزراوقات ہوئی تھی۔ تم
 پر چھنا چاہتی ہو گی کہ ہماری محبت میں کھل نے کیا کیا تھا! جانا ہوں۔ یہاں سے پاس صرف یہی
 ایک کھل تھا اور یہ میرا نہیں، میرے روم میٹ یعنی نواز احمد کا تھا۔ یہ ہم دونوں کا ایک طرح
 سے مشترک اثاثہ بن گیا تھا اور وہ یوں کہ جب بھی کسی کو اپنے گھر جانے کی ضرورت پڑتی تھی،
 تو وہ بلا تکلف یہ کھل ساتھ لے جاتا تھا اور وہاں ہی پر ساتھ لے آتا تھا۔ ایک بار مینڈریسی دیکر
 کا تھا۔ گھر سے خط آیا کہ آباجی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میں پریشان ہو گیا اور فوراً گھر
 روانہ ہونے کی تیاری کر لی۔ ہوشل سے باہر نکل کر تلگے میں بیٹھنے والا تھا کہ نواز بھاگا بھاگا آیا،
 اس نے کھل اٹھا کر کہا تھا جسے میں پریشانی میں بھول گیا تھا، تمہارا رفیق سفر! اس نے کھل
 میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔“

میں نے کھل لے لیا اور تلگہ چل پڑا، جب تک تلگہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا
 وہ وہیں سوئی میں کھڑا رہا۔

گھر پہنچا، تو آباجی کی طبیعت کافی خراب ہو چکی تھی اور انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔
 میں مزید چھیڑوں کے لئے غرضی بھیجا رہا اور اسی طرح پندرہ روز بیت گئے۔ اس کے بعد آباجی
 سنبھل گئے اور میں گھر سے نکل پڑا۔

رضیہ نے سرخچکار کا تھا اور دونوں ہاتھوں کی، ہتھیلیاں اس کے رخساروں سے مس کر رہی
 تھیں۔ غصے نے بات آگے بڑھائی، ہوشل پہنچا تو معلوم ہوا، میری عدم موجودگی میں نواز احمد

کے دل کا تباہ و کراچی ہو گیا ہے اور وہ گھر کے لوگوں کے ساتھ دیاں چلا گیا ہے۔ اس کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا خط ملا جس میں اس نے یہ اطلاع دی کہ شاید انہیں ملک سے باہر جانا پڑے اور یہ اس کا آخری خط تھا؟

رضیہ نے اپنے غم کے اضطراب سے اندازہ لگا لیا کہ اس کا اندرونی ہیجان جو کسی حد تک دب گیا تھا، پھر عود کر آیا ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے میں بیٹھنے لگا۔ رضیہ اسے کبھی کبھی کے قریب آتے اور پھر اس سے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد خیر الہی کرمی کے پاس آکر شہر گیا اور دیکھ بھری آواز میں بولا، وقت گزرتا گیا اور مجھے اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ رضیہ ایم اس کا کبیل لے آیا تھا اور اسے واپس کرنا چاہتا تھا۔ دنیا میں جو بھی اس واسطے کو سنے گا وہ یہی کہے گا کہ یہ بات نہایت معمولی قسم کی ہے۔ یہاں دوست اس بے کار پرانے فرسودہ کبیل کو کیا کرے گا، لیکن میرے دل میں ایک جھجک ہے۔ میں اسے اپنے دوست کی لمانت سمجھتا رہا ہوں اور بدستور سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ لمانت واپس کر دینی چاہیے۔ اسی لئے اسے اپنے پیڑوں کے ساتھ حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب میں یہ لمانت لوٹا دوں گا۔ اور یہ خط؟ رضیہ نے سوال کیا۔

یہ خط؟ بتاتا ہوں۔ میں کبھی کبھی کچھ دوستوں کو خط لکھ کر نواز کے ارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ سوائے ایک کے سب نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ملک چھوڑ گیا ہے۔ کہاں، یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس شخص نے جس کا نام اطراف اچھا ہے، کبھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے بالکل باورس ہو گیا تھا کہ اب چار پانچ سال بعد اپنا ملک اس کا خط آ گیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ نواز جو کبھی نواز احمد تھا، آج شیخ نواز احمد کے نام سے داد پٹلی میں مقیم ہے۔ گورنمنٹ کٹر کٹر ہے اور بہت خوشحالی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو، اب میں اس کی لمانت لوٹا سکتا ہوں، لیکن —؟

رضیہ مضطرب کہانی دینے لگی تھی: آپ نے کبھی مجھے یہ بات بتائی تھی؟

رضیہ کا سوال معقول تھا اور رضیہ کو اس کا جواب دینے میں رقت ہو رہی تھی: بھئی میں نے تو میں یہ سوچا تھا کہ امانت محفوظ ہے؟

لیکن بتانے بغیر کیسے محفوظ رہ سکتی تھی؟ رضیہ نے کہا۔

خیر جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بتاؤ کہ کیا کیا جانے، جس طرح بھی ہو، چراغ بی بی سے وہ کبل واپس لے لو؟

ضمیر نے یہ کہنے کے بعد اس کا رد عمل اپنی بیوی کے چہرے پر دھونڈنے کی کوشش کی اور رد عمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔

آپ خود سوچئے کیا یہ کوئی مناسب بات ہوگی؟ بوڑھیا کیا کہے گی؟ جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، دوسرے نہیں سوچ سکتے، اس چیز کو مت بھولنے کو وہ تو کہانی ہے اور میں اسے کبل دے چکی ہوں۔

ضمیر کے اندر وہ جھنجھلاہٹ جو دب سی گئی تھی، پھر بیدار ہو گئی: اچھا، مات مانگو، میں خود مانگ لوں گا: اسے نیا کبل مل جائے، تو پڑا کبل لٹانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بلکہ وہ تو خوش ہو جائے گی؟

رضیہ نے اپنی اندرونی کھکش پر قابو پایا تھا: سو جائیے جا کر آؤہ بولی۔

سو جاؤں؟

ہاں آپ جو کچھ چاہتے ہیں، ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر رضیہ بیڑھیوں کی طرف جانے لگی چند منٹ کے بعد ضمیر بھی نیچے اترنے لگا۔

بلک جانے سے پیشتر ضمیر نے بیوی کو تاکید کر دی کہ چراغ بی بی جب آئے تو سب سے پہلے اس سے کبل واپس لینے کی کوشش کرنا اور اسے معقول رقم دے دینا۔ رضیہ نے اقرار کیا۔ چڑھیا ورنہ اس رقت آجانی تھی، جب ضمیر اور اہلی خانہ یا تو ناشہ کر چکے ہوتے تھے یا کہ رہے ہوتے

تھے، لیکن اس روز وہ دیر سے آئی۔

”اماں! رضیہ نے اسے مخاطب کیا اور چراغ بی بی نے سمجھا کہ اس کی ماکن دیر سے آنے کی وجہ پوچھ رہی ہے۔ بولی تو اسارات، ہمارا ہو گیا تھا، ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی؟“

”اماں! میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

چراغ بی بی پریشان ہو گئی اور اس کے سامنے کھڑی رہی۔

”بیٹھو اماں! ایک بات کرنی ہے تم سے۔“

چراغ بی بی بیٹھ گئی، تو رضیہ نے اپنے پرس میں سے دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور انہیں اس کی دائیں ہاتھ کی کھنٹی کے پاس رکھ دیا۔ یہ کہنی اس نے میز پر نگار رکھی تھی۔

”بات بہت سہولت ہے۔ میں نے تمہیں ایک کبل دیا تھا۔ اماں یاد ہے نا؟“

”بڑھپا! نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔“

”اس کی جگہ یہ روپے لے لو ان سے نیا کبل خریدا جاسکتا ہے۔ اس سے بہتر اور اچھا۔“

بڑھپا شاید کچھ سمجھ نہیں سکی تھی یا سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ماکن کی بات خود سے نہیں سن سکی۔

وہ کبل اصل میں کسی کی لمانت تھی جو صاحب کو واپس کرنا تھی مجھے اس کا پتہ نہیں تھا

لے آئی ہو مگر سے! روپے لے لو!

بڑھپا نے روپے نہیں اٹھائے۔ بولی آبی بی! میں کیا کروں مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کسی کی

لمانت ہے؟“

”تو کیا کیا ہے تم نے اس کا؟“

”کرنا کیا تھا بی بی! پتہ ہوتا تو نہ دیتی پہلی جمعرات کو میرا چھوٹا بھائی یوسف آیا تھا۔ میں

نے اسے دے دیا۔“

رضیہ کرسی سے اٹھ بیٹھی، اسے کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ چراغ

بی بی کہنے لگی: اس کی جہنم میں دکان ہے صبح سویرے اماں پر بیٹھ جاتا ہے۔ سردیوں کے دن

”جیہ میں نے کہا یوسف! یہ کیل بی بی نے مجھے دیا ہے۔ تم بے لوث۔
 ”نرم نے اپنے بھائی کو دے دیا ہے اور رضیہ کے لیے میں بے تابی نمایاں تھی۔
 ”بی بی تم نے مجھے دے دیا تھا؟“

رضیہ سمجھ گئی کہ اناں کیا کہنا چاہتی ہے۔ یہ کہنا چاہتی ہے کہ جب تم نے کیل سے دیا تو وہ
 بری چیز تھی جسے چاہتی دے رہی تھی۔

چند منٹ کے بعد ہی ضمیر نے ٹیلیفون کیا اور جب رضیہ نے اسے بتایا کہ وہ ترجمہ کے
 ایک وکلائر کے پاس ہے تو اس نے کہا اناں سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھ لو۔
 رضیہ ٹیلیفون بند ہونے کے بعد بھی ریسیور ہاتھ میں لئے میز کے پاس کھڑی رہی۔ اسے یہ
 بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ ملازم سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھے تاکہ اس سے کیل واپس
 لیا جائے۔

پچاس کے نوٹ دو میں پڑے تھے۔ اناں نے اٹھانے نہیں تھے۔ نوٹ دیکھ کر اس کے
 اندر اپنی توہین کا احساس ابھر آیا۔ ملازم سے اس معاملے میں ایک لفظ تک نہ کہا اور نوٹ
 واپس اپنے برس میں رکھ لئے۔

جس وقت اناں معمول کے مطابق جانے لگی تو اس نے دو تین بار میز کی طرف دیکھا اور رضیہ
 نے اسے کلکیوں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں اور اناں چلی گئی۔ رضیہ بچوں سے باتیں کرنے میں
 مشغول ہو گئی۔

ضمیر ساڑھے سات بجے گھر آگیا اور کپڑے تبدیل کئے پھر اس نے پوچھا،
 ”کیسے یہ اناں جھوٹ تو نہیں بولی رہی؟“

”مجھے کیا خبر؟ رضیہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

یہ الفاظ ضمیر کو چھبے اور اس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی؟ ٹھیک طور پر اس سے پوچھا جوتا۔
 ”تو کیا میں نے غلط طور پر پوچھا تھا؟“

ضمیر نے بھری کے رونے کا کچھ زیادہ خیال نہ کیا بولا : "میرا مطلب ہے اسے پیسے دے دیئے ہوتے ؟"

"دیئے تھے، لیکن اس نے کبل اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔ جھوٹ بولنے کی اسے ضرورت کی تھی ! پچاس روپے مل رہے تھے، وہ پرانا کبل تو کوئی پانچ روپے میں بھی نہ خریدے۔ یہ تو درست کہا ہے تم نے اس کے بھائی کا پتہ کیا ہے ؟"

"آب جہلم جائیں گے ؟"

"ظاہر ہے وہ کبل دینے کے لئے کرایہ خرچ کر کے لاہور نہیں آئے گا۔"

رضیہ باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

ضمیر بولا : "میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ اپنی تو، بہن کا وہ احساس جو دب گیا تھا، یکایک ایک چنگاری

بن گیا۔ تنک کر بولی : "کیا آپ کو اس کا خیال نہیں آتا کہ ایک پرانا، فرسودہ، سیلا کچیللا بیوروہ

کبل واپس لینے کے لئے آپ جہلم جائیں گے۔ ایک بہت معمولی دکاندار کی دکان پر ضمیر

خاموش رہا۔

"کیا کہیں گے، آپ اس سے، خدا را کچھ تو سوچئے ! سوچئے کیوں نہیں آپ ؟"

رضیہ نے ایک ہی سانس میں یہ سارے الفاظ کہہ دیئے۔

ضمیر کا رویہ ابھی تک بدلا نہیں تھا۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے گھبراہٹ بڑھتا بڑھتا "نہیں"

"نہیں۔۔۔ تم نے پتہ نہیں پوچھا۔۔۔ میں نے تاکید کی تھی۔۔۔ اب ضمیر پر غور کرو۔"

ہو گیا تھا۔

"آخر کیا کہتی اس سے ؟"

"اس کے بھائی کا پتہ پوچھتیں اور کیا کہتی ؟"

”اگر آپ کو اتنا ہی خیال ہے تو ایک قیمتی کپیل خرید کر اپنے درست کمرے دیں؟“
 ضمیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا: ”کیا بے معنی اور بے کار بات کرتی ہو، میں امانت واپس
 کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے قیمتی کپیل خریدنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اناں
 چراغ بی بی سے اس کے بھائی کا پتہ کیوں نہیں پوچھا؟“

رضیہ، جس کا یہ حال تھا جیسے اس نے کوئی بھیسا تک خواب دیکھا ہو، آہستہ آہستہ کمرے
 سے باہر نکلنے لگی، منیر نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: ”جواب دے کر جاؤ!“
 ”میں نے پتہ نہیں پوچھا، رضیہ نے جانتے جانتے کہہ دیا۔“

بچے باپ کی بلند آواز سے جاگ اٹھے تھے اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے
 منیر نے ایک لمحے کے لئے انہیں دیکھا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

رضیہ کو رات کے وقت شوہر کے آنے کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ وہ تنہا روتے روتے سو گئی تھی
 صبح جب بیدار ہوئی، تو ضمیر کا پتنگ خالی تھا۔ اس نے باہر آکر دیکھا گھیراج میں گاڑی بھی نہیں
 تھی۔ وہ پریشان ہو گئی: ”اللہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے میرے اللہ! وہ کیا منٹ
 والوں کے کنارے ہوا کے سرد جھونکوں میں کھڑی رہی اور پھر سوچ کر کہے باہر نہ آجائیں۔“
 اندر چلی گئی۔

سورج نکل چکا تھا۔ گرامس کی حرارت میں ابھی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی، جہلم کے ایک
 بازار میں ضمیر کی کار ایک معمولی سی دکان کے سامنے رک گئی۔

بازار کی کچھ دکانیں کھل چکی تھیں اور کچھ ابھی بند تھیں اور وہ دکان جس کے قریب منیر کی
 کار کھڑی تھی، ابھی بند تھی، منیر گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور اس بند دکان کو غصے سے دیکھ رہا
 تھا۔ چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ اوچھڑا کر ایک شخص میلے کپیلے کپڑوں میں مبوس دکان پر آیا
 اور دکان کھولنے لگا، منیر اسے ٹھٹھکی باز دھک دیکھ رہا تھا جب دکان کے دونوں پٹ کھل گئے اور
 نکالدار دکان کے اندر جا کر بھاڑوے آیا، تو یکایک اس کی نگاہ منیر پر پڑ گئی اور جلدی سے بولا:

”ہاؤ جی آپ؟ وہ تھلے سے نیچے اتر گیا۔

”اماں، کیا تم چراغ بی بی کے بھائی ہو؟“

دکاندار کے ڈیلے پھیل گئے: ”جی۔۔۔ جی۔۔۔ کیا برا میری بہن کو؟ اس نے جیسے سانس

رودک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں ہوا بسنی، یوسف ہوتا تم؟“

”جی، جی، فرمائیے جی، میری بہن نے بھیجا ہے نا آپ کو؟ اللہ خیر کرے؟“

ضمیر اس کا ہاتھ بڑا کر ایک طرف لے گیا: ”تم مجھے جانتے ہو۔“

”جی ہاں، آپ کو یاد نہیں دیا، ایک دفعہ بہن سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا؟“

اچھا تو سنو! وہ کیل جو تھپاری بہن نے تم کو دیا ہے، اصل میں کسی کی امانت تھا۔ میری

بیوی یہ بات نہیں جانتی تھی۔ اس نے چراغ بی بی کو دے دیا تم جانتے ہو امانت۔۔۔ امانت

ہوتی ہے، جانتے ہو نا، کیوں یوسف؟“

”جی۔ جی جاتا ہوں جی، یوسف نے جواب دیا۔

”تم اس کی جگہ کیا کیل خرید لو، یہ تو ضمیر نے جیب سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر اس

کی طرف بڑھا دیئے، یوسف نے دو تین لمبے توقف کیا، پھر نوٹ لے لئے اور انہیں کرتے کی جیب

میں رکھتے ہوئے بولا: ”وہ گھر میں ہے جی؟“

مجھے جلد واپس جانا ہے، تکلیف کر سکو تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

یوسف نے ساتھ والی دکان کی طرف دیکھا۔ دکان ابھی کھلی نہیں تھی۔

”یہ آج لے لو جاؤں گا جی۔“ یہ کہہ کر دکاندار صفائی میں مصروف ہو گیا۔

ضمیر کھڑا رہا، اتنے میں ساتھ والی دکان کا مالک آ گیا۔ یوسف بولا،

”حسن یار! یہ باؤ جی آئے ہیں، بس تھوڑی دیر گئے گی ہیں، بس ابھی آیا؟“

حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”گھر دور ہے یا نزدیک؟ ضمیر نے پوچھا۔

”نزدیک ہی ہے جی۔ بس پہنچنے کے پہنچنے۔ وہ دکان سے اتر کر ایک طرف مدانہ ہو گیا۔
ضمیر یوسف کے ساتھ چلتے نگا۔ آدھ فرلانگ کے بعد ایک معمولی سے ایک خزانہ مکان کے سامنے
رک گیا اور بہت اپنائیت سے بولا: ”میں دروازہ کھولتا ہوں؟“

”نہیں بھئی۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ بینک میں میرا انتظار ہو رہا ہے؟“

”اچھا جی۔ کہہ کر یوسف اندر چلا گیا۔

ضمیر گی کی کڑ پر تنہا کھڑا تھا۔ اوجھ سے جو بھی گزرتا تھا اسے جھرت سے حضور دیکھ لیتا۔
اس قسم کا تجربہ اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی الجھن محسوس کر رہا تھا
جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پھر اندر سے ایک مردانہ اور ایک زنانہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں
سے غصہ اور زبردستی تو ریح کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس پر کچھ لوگ تماشہ دیکھنے کیلئے مکان کے دروازے
کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”کیا بات ہے باؤ جی؟ ایک شخص نے پوچھا۔

”جیسے کیا خبر؟ ضمیر نے بیزار ہو کر جواب دیا۔

اس شخص کی نظریں پڑتھ رہی تھیں تو تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد یوسف باہر آ گیا اور نادام سا ہو کر بولا: ”باؤ جی، کال ہو گیا ہے!“

ضمیر کے ساتھ اور بھی لوگ جو وہاں ٹھہر گئے تھے، یوسف کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

”آؤ باؤ جی! یوسف نے ضمیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا: ”باؤ جی، کیا ہے؟“

ضمیر نے پوچھا۔

”میری نامزد ہوئی نے کبیل اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔ رات وہ آیا تھا مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔

”تو اب؟“

”باؤجی یہ اول نمبر حوالہ ہے۔ گھر پر نہیں ہو گا۔ میں اس کے دو تین ٹھکانے جانتا ہوں۔ بل جانے گا باؤجی۔ گھبراؤ نہیں۔ جانے گا کہاں کھیلنے کرے؟“

ڈیڑھ گھنٹہ تک یوسف، ضمیر کو گلیوں میں لئے لئے پھرا۔ کئی دکانداروں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ کسی نے کہا صبح اس نے بٹے کی دکان سے نسی پی تھی۔ کسی نے اطلاع دی وہ کچھ دیر پہلے بیس سے گزرا تھا۔ یوسف ضمیر کو اس کے گھر پر بھی لے گیا۔ مگر بے سود۔

دوہرہ ہونے والی تھی اور ضمیر چل چل کر خشک گیا تھا۔ اسے یہ فکر بھی تار ہی تھی کہ وہ بنگ سے ہو کر نہیں آیا تھا۔ سلوم نہیں دلاں کیا سالہاں وہ پیش ہوں۔ بالآخر یوسف اسے واپس اپنی دکان پر لے آیا اور دلاں آکر بولا: ”باؤجی! آپ کو کھیل چاہیئے نا؟“

”تو اور کس کام کے لئے وقت ضائع کر رہا ہوں؟“ ضمیر نے طعنے سے کہا۔

”بل جانے گا۔ آج شام نہیں۔ تو کل کسی وقت ضرور آجاؤں گا۔ گھبراؤ نہیں باؤجی!“

ضمیر اچھا کہہ کر اور اسے فوراً کھیل بیچانے کی تاکید کے ساتھ کرائے کے لئے بیس روپے دے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی وہ بڑی بے دلی سے چلا رہا تھا وہ سیدھا بنگ ہی میں پہنچا۔ ملے سے پریشان دیکھا۔ تو ہر دکن کسی قدر پریشان ہو گیا۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ گرد آلود اور آنکھوں میں بالیوسی کے سائے سے چھلکتے ہوئے۔ اس کی ایسی حالت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہر شخص خیر تو ہے، کے انتظار کے ساتھ اس کے پاس آئے نکلا۔

”کوئی ایسی بات نہیں۔ ایک مسئلہ ہے۔ محل جو جانے گا: وہ ہر لمحہ اپنے دالے کو قریب قریب یہی جواب دیتا۔“

شام کے وقت جب گھر آیا تو اس کی بیوی اور بچے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کی بہیت کڈائی دیکھ کر ہر فرد خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے بچوں سے دیکھی امتاز میں حال چال پوچھا اور اوپر چلا گیا۔ ساتھ ہی رضیہ اور اگنی بولی: کہاں چلے گئے تھے آپ؟

تم نہیں جانتیں؟

”جانتی ہوں، لیکن کم از کم اطلاع دے کر تو جاتے، کیا بنا، کیا ہوا؟“

ضمیر نے غصے سے کہا کہ اس کی بیوی، جس نے اس کا تیرہ برس ساتھ دیا تھا اور جس کا اس پر سب سے زیادہ حق تھا، ایک گہری بے اعتمادی کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ اس کے چہرے پر وہ شادابی نہیں ہو ایک لمبی رفاقت اپنے ساتھ لاتی ہے سوچنے لگا کیا وہ اس سے بدظن ہو گئی ہے کیا اس کے ذہن میں بدگمانیاں بڑھ رہی ہیں۔

”کیا بنا؟ — کیا ہوا؟“ یہ الفاظ جیسے رضیہ کی پیشانی پر چبیاں جو کر رہ گئے تھے اور مسلسل سلگ رہے تھے ضمیر نے کوشش کی کہ اس واقعے کی سنگینی یا بددلت کریمت حد تک کم کر دے چنانچہ کہنے لگا ”آماں چراغ لی بی کا بھائی لے آئے گا۔“

”کیوں؟“ یہ الفاظ رضیہ نے ایسے ہیچے میں کہے تھے کہ طنز کی کڑواہٹ ضمیر غصے سے بیٹھ کر نہرہ سکا۔ ”گڑ کر بولا، ہاں کیوں؟“

”شکر ہے خدا کا۔ میں ایک بھاری مصیبت سے نجات ملے گی، کھانا لگایا جا رہا ہے۔“

”آئیے؟“

”آماں ہوں،“ ضمیر نے کہا، اسے اپنے کمرے میں کوئی کام نہیں تھا، مگر وہ چوری کے ساتھ بیچے اترنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکا۔ شاید رضیہ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کے آخری فقرے کا بہت بڑا مانا ہے۔

کھانا قریب قریب خاموشی کے عالم میں کھلایا گیا۔ رضیہ نے نہ اس سے پوچھا کہ جہاں وہ گیا تھا وہاں اس پر کیا برکتی اور نہ ضمیر نے خود اسے کچھ بتایا۔ بچے باپ کو کنگھیوں سے دیکھتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔

یوسف نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسرے روز ہی کیل لے کر لاہور آجائے گا، مگر تین روز گزر گئے اور وہ نہ آیا۔ رضیہ نے اپنے شوہر کی بڑھتی ہوئی پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور اماں کو کراہ دے کہ اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا، ضمیر کو اس کا علم نہیں ہوا۔

چوتھے روز وہ بنک جانے کے لئے کپڑے بدل کر بیٹھ آیا، تو رضیہ نے اسے دیکھ کر اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ بولی: "اُمّ! آج نہیں تو کل ضرور آجائے گی۔"

"تم نے اسے بھیجا ہے؟"

"کیا کتنی؟ میں نے اسے بڑی تاکید کی تھی کہ ہر حال میں کل شام تک آجائے۔ آج ضرور آجائے گی؟"

شاید وہ —! ضمیر کے ہچے میں تذبذب تھا۔

"آپ کی امانت آپ کو مل جائے گی۔ یہی چاہتے ہیں نا آپ؟"

ضمیر نے اپنی بیوی کے فقرے کی خشریت محسوس کر لی۔ تلخ لہجے میں بولا: "رضیہ میں تمہیں بھیجنا نہیں سکتا۔"

"مجھے کچھ مجھے کی ضرورت بھی نہیں۔ رضیہ نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

ضمیر نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا، ہر حال کر گاڑی شارٹ کرنے لگا۔

بنک میں کام کرتے وقت ضمیر کے ذہن میں بار بار یہ سوال چھٹنے لگتا تھا کہ اُمّ! کب ملے گی یا نہیں۔ یوسف نے کہا تھا کہ اس کی بیوی کا سہا نجا جواری ہے اور جلدی سے ہر قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔

○

منگل کی صبح تھی۔ اُمّ! چراغ بی بی کو حیلہ ملے چار روٹ گزر چکے تھے۔

اب تک تو اسے ہر حال میں آجانا چاہیے تھا! ضمیر نے ناشہ کرتے وقت کئی بار سوچا۔ رضیہ بچوں کو ناشہ کروا کر سکول کے لئے تیار کر رہی تھی، ضمیر تک میں جلدی پہنچ جا رہا تھا۔ اس نے بچوں کو گاڑی میں بٹھایا اور انہیں ان کے سکولوں تک پہنچا کر خود بنک چلا گیا۔ بارہ بجے تک کام کا اس قدر مجموعہ رہا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی فراغت نہ پاسکے۔

بارہ بجے روزمرہ کے معمولات کا سلسلہ شروع ہو گیا، تو اس نے گھر فون کیا اور اس سے مشترکہ وہ کچھ کہے رضیہ کی آواز آئی: "اُمّ! آگئی ہے؟ اور یہ کہہ کر اس نے ٹیلفون بند کر دیا۔

”رضیہ نے پہلے کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا تھا: آج کل اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے سوچا اور گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

”کہاں ہے اماں؟“ اس نے گھر پہنچتے ہی بیوی کو مخاطب کیا۔

”اوپر! رضیہ کا بہت مختصر جواب تھا۔

”اماں اوپر ہے؟“

”نہیں! رضیہ پکڑے گل کر دھوئی کو دے رہی تھی وہ اپنے کام میں بڑی طرح مصروف تھی۔

ضمیر اوپر چلا گیا میز کے اوپر خاکی رنگ کے کاغذ میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز پڑی تھی۔

”تو گرا وہ کبل لے آئی ہے؟“ اور اس نے مہلت نام کاغذ الٹ کر دیا، ایک خوشنما کبل

اس کے ہاتھوں میں تھا۔ ایک دم اس کے دل و دماغ میں سونیاں سی چھینے لگیں: رضیہ! وہ گرا

اور ساتھ ہی دو دن سے میں سے رضیہ داخل ہو گئی، لہلی دھینچنے ست آگئی ہوں۔ فرمایے!

”میرے ساتھ یہ مذاق! — یہ وہ کبل ہے جو تم نے اماں کو راتھا؟“

”نہیں!“

”بھریہ کیا ہے؟“

”آپ دیکھ نہیں رہے کبل ہے۔ وہ کبل اماں نہیں لائی۔ لاسکتی بھی نہیں۔ میں ایک بڑی

مصیبت سے نجات پانے کے لئے یہ کبل بازار سے لے آئی ہوں!“

”رضیہ! ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو اس طرح تنیش دی کہ اس کا

رنگ چلا پڑ گیا اور جب اس نے ہاتھ ہٹائے تو وہ ڈنگا گئے لگی۔

”میرے ساتھ یہ مذاق! — غرض تو نہیں آئی!“ وہ اور بھی اونچی آواز میں گر جا۔

رضیہ چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر اس آغاز سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اس کا سارا

جسم کانپنے لگا: ”یہ کیا کرتی؟“ آپ نے گھر کو جسم ہٹا دیا ہے۔ سارا اطمینان تباہ کر دیا ہے!“

”مگر اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ بھی لڑنا یا جا سکتا ہے؟“

”یہ امانت نہیں ہے؟“

”اس سے تو بہتر رہی ہے؟“

”رضیہ! ضمیر نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ اس کے شانوں کی طرف بڑھائے، رضیہ جھٹ پھجے ہٹ گئی، مگر دوسرے ہی لمحے اس کے قریب آگئی، جھٹلا کر ہول“

”شانوں کی طرف نہیں، گردن کی طرف ہاتھ بڑھائیے۔ میں حاضر ہوں۔“

ضمیر نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا، کبیل ندر سے دیوار پر دسے مارا اور کھٹ کھٹ

بچے اتر گیا۔

وہ سرکک پر چلا جا رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے: ایک ذہیر آلود لہر بار بار اس کے دل و دماغ میں سے گزرتی تھی اور اپنے بچے اپنا اثر چھوڑ جاتی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ضمیر کی کار جہلم کی طرف چلی جا رہی تھی، ایک کار سے اس کا تصادم ہوتے ہوئے بچا، ایک ٹرک سے بھی یہی حادثہ پیش آئے والا تھا کہ خوش قسمتی سے ٹرک کے ڈرائیور نے پیسٹ پر ایک سخت کنٹرول کر لیا اور ضمیر کے گاڑی میں کوئی لمحے کو تیار ہوا۔

یوسف اپنی دکان پر موجود نہیں تھا ایک اور شخص اس کی جگہ گاہکوں سے پنٹ رہا تھا۔

”یوسف کہاں ہے؟“ ضمیر نے پوچھا۔

”وہ جا رہے۔ گھر رہے۔“

ضمیر اس کا گھر دیکھ چکا تھا۔ گاڑی کو منتقل کیا اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر آواز دی، تو ایک عورت نے دروازے پر آکر پوچھا: کون ہے؟

”یوسف سے کہہ دو، لاہور سے ضمیر باہر آیا ہے؟“

عورت اسے اندھے گئی، یوسف چارپائی پر بٹا ہوا تھا، رکی گشتگو کے بعد ضمیر نے اس سے کبیل کے بارے میں دریافت کیا۔

”باؤ میں کیا کروں؟ ابھر کا پتہ بتا تا ہی نہیں کہ کہاں رکھا ہے۔ باز بڑا جھارپا ہے۔“

یوسف کے منہ سے یہ لفظ نکلے ہی تھے کہ اس کی بیوی کو جیسے آگ لگ گئی، جھارپا ہے تو اپنے گھر ہے، قہار! کچھ لے تو نہیں گیا، جھارپا ہے جھارپا ہے۔ میں کہے دیتی ہوں آدمی کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے؟“

یوسف اٹھ بیٹھا، خیر کو خدہ شہناک یہاں ایک نیا ہنگامہ برپا ہو جانے لگا۔ اس نے یوسف کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ”ذرا باہر چلو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

اس طرح وہ ہنگامہ توڑ لی گیا، لیکن اب بھی خیر بدستور پریشان تھا۔

”باؤ جی! وہ بل جانے تو اس کا کچھ مر نکال دوں گا، تم نے کیوں تکلیف کی؟ — میں کبلی شہر میں بیٹھا دوں گا۔“

”یوسف! یہ بتاؤ تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟ خیر نے اس سے پوچھا۔“

”ہے باؤ جی۔“

خیر صبح میں پڑ گیا۔ اس نے حیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا۔ یہ لو پھل ول کھا لینا؟ ہاتھ میں نوٹ لے کر یوسف کی آنکھیں چمک اٹھیں، ”باؤ جی! اتنی دور سے کسے ہو، موٹر کار کہاں ہے؟“

”قہار! دکان کے پاس۔“

”باؤ جی! اکبر کا گھر کافی دور ہے۔“

”تو تانگے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔“ خیر نے کہا۔ یوسف نے مصاحبتی غماہ کی اور وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ پلوں گھنٹے کے بعد کہیں ناگہان ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رکا۔ یوسف جلدی سے اتر اور اس مکان کے اندر چلا گیا۔ کئی منٹ کے بعد باہر آکر اس نے بتایا: ”وہ گھر میں ہے نہیں۔ کبلی بھی نہیں ہے۔ سچ کہا ہے اس نے — پٹکا جھارپا ہے باؤ جی! خیر اسے تلاش کرتے ہیں، آئیے!“

تاں گھر ایک گھنٹے تک مختلف مصلحت پر دکتار باخروہی دودھ والے کی دکان پر رہا، تو یوسف چلا گیا، مگر نیچے اترا اور اس نے پیچ پر بیٹھ بیٹھنے پرانے کپڑوں میں جوسس ایک فوجیوں کو پکڑ لیا۔ منیر نے سمجھ لیا کہ یہی اکبر ہے اس نے تلگے سے اتر کر یوسف کو اتار دیا کہ اسے چھوڑ دو، یوسف کی گرفت بھی بڑھ گئی، تو وہ اس کے قریب گیا اور دست نرمی سے بولا: اکبر! مجھے اس کبل کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ لانت تھی میرے پاس — دے دو میرے بھائی؟

اکبر نے آنکھیں جھکائیں، یوسف بولا: باڈا اس نے پیچ کھایا ہے اس نے: تم چپ رہو یوسف! میں خود بات کر رہا ہوں — دیکھو اکبر! اگر ایسا ہے — کسی کو دے دیا ہے، تو میں اس کی دو گنی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔ جتنی رقم چاہیے لے لو: منیر نے جب سے پھر پرس نکال لیا۔

”کچھ نہ دو باڈا۔“ یوسف نے مداخلت کی منیر نے خشک نظروں سے اسے دیکھا اور وہ اپنا فقرہ مکمل کر سکا۔

اور تو کوئی بات نہیں اکبر! یہ لانت ہے اور تم کو خبر ہے نا کہ لانت:

اکبر نے سر ہلک کر کہا، میں جانتا ہوں۔ باڈا جی:

”تو یہ رقم رکھ لو — کب لاؤ گے؟“

اکبر دو تین لمحے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا: پیسے پاس رکھیے میں نے جو کچھ لیا ہے وہ اسے دے دوں گا۔ کبل آپ کو گھر پہنچ جائے گا:

”جھوٹ بتاتا ہے یہ، کبل گھر پہنچانے گا۔“ یوسف یہ لفظ کہے بغیر زندہ رہا۔

”یوسف! تم خاموش رہو! اور وہ اکبر کی طرف مڑا: اکبر! یہ لے لو۔“ بولو کب، لاؤ گے کبل:

اکبر نے نوٹ لے لئے، یوسف جلدی سے بولا: باذ قیامت تک کبل نہیں لے گا۔ مجھ

سے کھسارو:

”یوسف تم چپ نہیں ہو گے! منیر نے ڈانٹ بلائی۔

”جناب! میں دن کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ کل پرسوں کیل خود لے کر آ جاؤں گا۔ مجھے آپ کا ہتہ معلوم ہے؟“

ضمیر نے دیکھا کہ اکبر کے لفظوں سے غلطی مترشح تھا اور اسے یقین ہو رہا تھا کہ اکبر جھوٹ نہیں بول رہا۔

ضمیر نے گھبراہٹ سے پوچھا: ”رضیہ! کل پرسوں ایک شخص آئے گا۔ اپنا نام اکبر بتائے گا۔ میں ایک میں ہوں، تو فوراً خبر کرو نہ!“

”اچھا! رضیہ کا جواب تھا۔“

”بھون! بالکل نہیں!“

”اچھا!“

اکبر نے کہا تھا پرسوں میں کیل لے آؤں گا، مگر تین دن بیت گئے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ ضمیر کی بے ثباتی بڑھتی جا رہی تھی، یوسف کے الفاظ گرم دیرت کے ذہن کی طرح اس کے دل و دماغ کو چھینے لگے تھے۔ سوچتا: ”اس نے درست کہا تھا۔ یہ اکبر جلدی ہے اس نے روپیہ جوئے میں مار دیا ہو گا: آتا کچھ کرنے اور روپیہ ضائع کرنے کے بعد بھی وہ اسی منزل پر تھا جس منزل پر اپنے شریک میں کیل نہ ملنے پر تھا۔“

○

پانچویں روز صبح کے وقت خیشے کے سامنے کھڑا شیو کر رہا تھا کہ اس کا لڑکا ادھر آ رہا اور اسے اطلاع دی: ”ابو! ایک آدمی آیا ہے۔“

”اکبر؟“ اس نے اضطراب کے عالم میں بیٹے سے پوچھا، لیکن لڑکا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے جلدی جلدی لیڈ رخساروں پر پھیرا۔ تو ایسے سے چہرہ پوچھا اور نیچے چلا گیا۔

دو دن سے پر اکبر کھڑا تھا جس نے اخبار کے کاغذوں میں کوئی چیز چھپا رکھی تھی۔ ضمیر خوش ہو کر بولا: ”آ لے آئے؟“

ہاں جی۔

ضمیر نے بے تابانہ ہاتھ بڑھا دیے۔ ذرا کاغذ ہٹا کر دیکھا۔ بھورے رنگ کا دی پرانا کبل تھا۔ اس نے گہرے کہا، آؤ اندر چل کر بیٹھو؟

نہیں جی، ذرا جلدی جاتا ہے۔

تو ذرا ٹھہرو۔ ضمیر کبل کو سینے سے لگائے ہوئے اندر گیا اور پلٹنا آواز میں بولا، رضیہ رضیہ! رضیہ باورچی خانے میں دو دو ابال رہی تھی۔ بچے کتابیں اپنے اپنے بیگ میں ڈال رہے تھے، انہوں نے باپ کو اس طرح چلاتے ہوئے دیکھا، تو کتابیں چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگے، رضیہ بھی آگئی۔

رضیہ! یہ دیکھو۔ وہ۔۔۔ کبل۔

سہارک ہو: رضیہ نے ایسے لمبے میں جواب دیا جس سے کوئی خوشی، کوئی المیہ ان کا ہر نہیں ہوتا تھا۔

وہ باہر کھڑا ہے۔ جو یہ لایا ہے۔ میرا پرس اوپر ہے۔ کچھ روپے دے دو؟ رضیہ نے المادی میں سے اپنا پرس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ضمیر نے پکیٹ میز کے اوپر رکھ دیا اور پرس لے کر باہر چلا گیا اور گہرے کی طرف دیکھ کر بولا، شکریہ! بہت بہت شکریہ یہ تو تمہارا انعام! اوپر پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور گہرے کو دے دیئے۔

اندر آ کر ضمیر نے جلدی جلدی دو ٹوٹ کھائے، ایک پیلی چٹائی کی پی اور کبل کے پکیٹ کو بٹل میں داب کر باہر جانے لگا۔ رضیہ بچوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کی ہدایت کر رہی تھی جو پریشان سے ہو کر باپ کو دیکھ رہے تھے۔

بنک سے فون آئے، ملائم مناسب جواب دے دینا۔ آج میں دہلی نہ جا سکوں گا۔ ضمیر نے کہا۔ رضیہ نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا شوہر سیدھا پنڈی جا رہا ہے۔

بچے چپ چاپ کھڑے تھے اور ان کی کتابیں ابھی تک میز پر بکھری ہوئی تھیں۔

”کتابیں سمجھاؤ اور ضیہ نے بچوں کو حکم دیا اور بچے کلاں پر جھک گئے۔ ضمیر دروازے سے کھل رہا تھا۔“

○

ضمیر جب لکھنؤ کو چلے گئے تو دھوپ پڑی پڑی مٹی اس نے جیب سے اٹلانی کا لٹا لٹکا اور اپنی منزل مقصود کا پتہ دیکھا۔

مری روڈ پر ٹول پمپ سے کچھ آگے کوٹھی کے باہر شیخ نواز احمد گورنمنٹ کونزرویٹو اس نے اشارہ کر کے ایک ٹیکسی لگوائی۔ ڈرائیور کو پتہ بتایا اور ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی جا رہی تھی اور اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کا تجربہ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا تھا جس پر بیک وقت معصومیت بھی تھی۔ پیار بھی اور گہری ہمدردی بھی اس چہرے پر پشانی کے پیچھے جو آنکھیں چمکی چمکی کی تھیں، ان سے ایک غلبہ معصومانہ سکھاٹ پھوٹ رہی تھی۔

یہ چہرہ اس کے روم میٹ نواز احمد کا تھا۔ وہ سوچنے لگا، ”اب نہ جانے اس کے چہرے میں کتنی تبدیلی آچکی ہوگی اور جب وہ مجھے اچانک دیکھے گا اور میں اسے کیل دکانوں کا جو ہماری شہر کو محبت کی یادگار ہے جو میرے پاس کی امانت ہے، تو وہ کیا کرے گا۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ کس طرح بے تابانہ — مجھ سے چٹ جانے لگا!“

اس کا دل زور زور سے دھکنے لگا۔

ٹیکسی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی تھی، مگر ضمیر اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔
نہرا وہ سامنے شیخ صاحب کی کوٹھی ہے۔“

ضمیر ٹیکسی سے اترا۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور ایک طرف جانے لگا۔

کوٹھی کے دروازے کے پہلو میں نیم بیٹ پر ابھرے ہوئے لفظوں میں لکھا تھا: شیخ نواز احمد گورنمنٹ کونزرویٹو۔

کمرے کے اندر سے تو اذوں کا ایک طوفان باہر آ رہا تھا۔ ان تو اذوں میں بلند قہقہے بھی تھے اور برتنوں کی کھٹکھٹناہٹ بھی۔ ایک شخص جو وضع قطع سے تو کر نظر آ رہا تھا، چائے دہلی ۷۷ اندر جا رہا تھا۔ ضمیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ شیخ صاحب سے کہو، لاہور سے ضمیر خاں آیا ہے؟

تو کر اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے باہر آ کر کہا: چلے جائیے؟

ضمیر نے پیکٹ بائیں بھل سے نکال کر دائیں بھل میں داب لیا۔ اندر صوفوں اور کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہنس رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

شیخ نواز احمد: ضمیر نے دعا دے پر دنگ کر رکھا۔

ایک وقت کئی ہاتھ ایک لمبم و شیم آدمی کی طرف اٹھے جو تنہا کوچ پر بیٹھا تھا۔

ہکون صاحب: لمبم و شیم آدمی نے پوچھا۔

نواز احمد: آپ؟

بھی فرمائیے؟

ضمیر نے حیرت سے گزشت کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا۔

میں ضمیر خاں ہوں؟

ضمیر خاں: اکون ضمیر خاں؟

شیخ صاحب کی آنکھوں سے اجنبیت جھلک رہی تھی۔

ضمیر خاں:۔۔۔! پیرانہ جوش میں ہم نے ڈیڑھ سال لکھے بسر کیا تھا۔ ایک ساتھ:

شیخ صاحب اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے۔ خدا پر دنگ کر بولے: صاف کیجئے۔ میں

خیر بتائیے کیسے آتا ہوا؟

ضمیر نے غصے کی طرح برف کا ایک بھاری تودہ اس کے سر پر آگرا ہے۔ شیخ صاحب اسی

لہذا سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو یاد ہو گا۔ اپنا کبلی چھوڑ کر آپ چلے گئے تھے۔ یہ میرے پاس رہ گیا تھا۔ آپ کی
لامنت تھا۔ آج۔۔۔“

ضمیر نے پکیٹ بغل سے نکال کر کہا۔

”لاحول دلا۔۔۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ شیخ صاحب کی آنکھیں جیسے اس کی حالت
پر شکوہ ہی تھیں، غلام احمد صاحب سے لے کر“

اپنے مالک کا حکم سن کر نوکر نے ضمیر سے پکیٹ لے لیا۔ ”نیکس مے نہیں؟“ شیخ صاحب نے
اٹکائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”جی، نہیں شکریہ“ اور ضمیر ہاتھ آگیا۔ اس کا تعاقب قہقہوں نے کیا جو اندر بند ہو گئے تھے۔
وہ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ کوٹھی سے باہر آگیا۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا اور
برف کے تودے نگار اس کے سر پہ گر رہے تھے۔

ساتواں چراغ

گرمی ہو یا سردی۔ شمال پہاڑی کی بندریوں سے سرو ہوائیں مسلسل نیچے اترتی رہتی تھیں۔ کبھی قرقری برھیل ہوتیں اور کبھی نسبتاً ہلکی۔ یہ ہوائیں جب بھی اس بے آب و گیاہ علاقے میں سے گزرتی تھیں تو کہیں بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی تھیں کیونکہ کوئی دیوار، درختوں کی کوئی قطار ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ برابر آگے بڑھتی چلی جاتیں اور گربا با صاحب کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے ان کی رفتار کبھی کبھی مدھم مدھم پڑ جاتی تھی تاہم جس وقت بھی وہ اس مقبرے کی بوسہ دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو دیکھنے والے کو فوراً یہ احساس ہو جاتا تھا کہ یہ دیواریں فی الحضور زمین بوس ہو جائیں گی، مگر برسوں سے پہاڑوں کا یہ عمل جاری تھا اور مقبرے کی یہ کمزور دیواریں بدستور اپنی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں۔ یہ غمزدہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں دھنسنے پڑ گئے تھے اور پہاڑوں کے جھونکے ان رخنوں میں سے گزر کر ٹوٹے پھوٹے مڑا کو چھوٹے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔

یہ بابا صاحب کون تھے؟ ان کی یہ ابدی قیام گاہ کب تعمیر ہوئی تھی اور ان دیواروں نے کب سر اٹھایا تھا؟ ان باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

بابا صاحب کے مقبرے سے ڈیڑھ میل دور جنوب کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں جی جی پور کے نام سے منور آباد تھا لیکن اس گاؤں کا بوڑھے سے بوڑھا آدمی بھی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اس گاؤں کو آباد ہونے نصف صدی سے زیادہ مدت نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پھر جب اس پانی کو مصرف میں لانے کے لئے ایک قریبی نہر میں منتقل کر دیا گیا

تو دلعنی علاقہ صوحج کی تہذیب سے سوکھ کر اس قابل ہو گیا کہ یہاں لوگ کچے کچے مکان بنا سکیں اور اور گرد و رہات میں رہنے والوں نے میلوں پھیلی ہوئی اس زمین کو دیکھا جہاں وہ آسانی سے سکھات قیر کر سکتے تھے کھیت بنا کر فصلیں اگا سکتے تھے تو وہ ادھر آئے گئے اور چند ہی سال میں یہاں اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔

اس گاؤں کا نام جی جی پور کیسے پڑا وہ اس سلسلے میں گاؤں کے پڑا نے لوگ بتاتے تھے کہ جب ان میں سے کسی نے سب سے پہلا مکان بنایا تو یہاں ایک جھوڑی میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو بالعموم نیم عریاں حالت میں دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے بتایا کہ وہ بابا صاحب کا سریر خاص تھا۔ چنانچہ وہ دن کا سارا وقت تو اپنی جھوڑی ہی میں بسر کرتا تھا اور جیسے ہی شام کی تاریکی فضلوں میں پھیلے لگتی تھی۔ بابا صاحب کے مزار پر چلا جاتا تھا اور تمام رات وہیں گزار دیتا تھا۔

بابا صاحب کو ملنے والے لوگ مزار پر کچھ نہ کچھ نذر نیاز چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شخص اس میں سے تھوڑا سا حصہ وصول کر کے باقی زائرین ہی میں بانٹ دیتا تھا اور یوں اس کے لئے قربت یا سوت کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔

گاؤں کا نام اسی شخص کی نسبت سے مشہور ہوا تھا۔ اس کا حقیقی یا پیدائشی نام کیا تھا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اور نہ وہ کسی کو اپنے بارے میں معلومات ہم پہنچانے کا خواہش مند ہی تھا اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر جی جی کہتا تھا ریلوں کہتا چاہیے کہ جی جی اسی کا ٹکئیہ کلام تھا۔ اس کے پاس عقیدت سے آنے والوں نے اسے ہار بار جی جی کہتے سنا تو اس کا نام ہی جی جی میاں رہنے لگے اور اس طرح یہ گاؤں جی جی پور مشہور ہو گیا۔

گاؤں والے جی جی میاں کا بہت احترام کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔ اس جی جی میاں نے گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بتایا تھا کہ بابا صاحب بڑے اونچے دھبے کے ہزرگ تھے۔ مگر طبیعت کے لحاظ سے تھے جلالی۔ بڑی جلدی ہلال میں آجاتے تھے

اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بلا تکلف جھڑک دیتے تھے۔

شاید انہی جی جی میاں نے بتایا تھا اگر بابا صاب کے مزار پر ہر جمعرات کو مٹی کا ایک چراغ جلا دیا جائے تو ساتویں جمعرات کو جب آخری چراغ جلا دیا جائے گا تو چراغ جلانے والے کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔

چراغ جلا دیا جاتا تھا مگر ابھی اسے مزار پر رکھا ہی نہیں جاتا تھا کہ شمالی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اسے بجھا دیتی تھیں۔ لگاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو گا جسے اس کا علم نہیں تھا اور جس کے دل میں یہ یقین جاگزیں نہیں تھا کہ ساتویں جمعرات کو چراغ جلانے والے کی آرزو ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ یہیں مشکل یہ تھی کہ اس آزمائش پر پورا اتنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ اول تو پہلی جمعرات ہی کو چراغ کی نو شمالی ہواؤں کے جھٹے سے سیاہ پوش ہو جاتی تھی اور اگر پہلے دو تین چراغ صحیح سلاست مزار تک پہنچ بھی جاتے تھے تو ان کے بعد جو چراغ جلا دیا جاتا تھا وہ ضرور بجھ جاتا تھا۔ عام یقین یہ تھا کہ اب تک جو کوئی شخص بھی یکے بعد دیگرے سات چراغ جلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ بابا صاب کی جلالی طبیعت کی کار فرمائی ہے ورنہ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والی سرد ہواؤں کا یہ کہاں حوصلہ کہ وہ صبح اس لمحے دیوار کے روزنوں سے اندر آئیں جب مزار کے قریب چراغ جلا دیا جاوے۔ جو یوں ساتواں چراغ جلانے کی کبھی قربت ہی نہیں آتی تھی البتہ بعض لوگوں کی زبان یہ بات سنی جاتی تھی کہ کافی مدت ہوئی ایک بار ایک دھوبن نے مزار پر ساتواں چراغ بھی جلا دیا تھا اور اس کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی۔ اس کا ریشا جو قتل کے مقدمے میں مانوڑ تھا پھانسی کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس حقیقت کی تصدیق اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ یہاں اور بیٹا دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اگر کوئی شخص مقبرے کے اندر جانے کی بجائے اس کے ارد گرد گھومتا تو اسے بے شمار ٹوٹے

ہوئے مٹی کے چراغ نظر آجاتے۔ یہ وہ چراغ تھے جو مزار پر دو دو تین تین یا زیادہ سے زیادہ چار چار کی تعداد میں جلتے تھے اور چونکہ یہ چراغ جلائے والے وہ شرط پوری نہیں کرتے تھے۔ یعنی سات جمعہ اتریں تک سات چراغ نہیں جلائے تھے۔ اس لئے ان کے چراغ مزار سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے گئے تھے تاکہ نئے مزار میں لاگنے والوں کو بھی قسمت آزمائی کا موقع ملتا رہے۔ یہ چراغ باہر کن پھینک دیتا تھا۔ اس سوال کے مختلف جواب دیئے جاتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ بابا صاحب کے واحد سرپرست جی میاں جو ایک روز چپ چاپ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر اس طرح غائب ہو گیا تھا کہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہی آدمی سات کو باقاعدہ یہاں آتا ہے اور چراغ باہر پھینک دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شمال سے آنے والی سرد ہوائی ہی ان چراغوں کو دھکیلتی ہوئی دروازے سے باہر لے جاتی ہیں اور یہ چراغ اس عمل کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

جی جی گاؤں کا سب سے متول آدمی نامرغیاں تھا جس کی زرعی اراضی میں مریعوں پر مشتمل تھی اور جس کی حویلی کے دکان میں سوکے قریب چار پائیاں بچائی جاسکتی تھیں۔ نامرغیاں ان آباد کاروں میں سے تھا جو سب سے پہلے یہاں گئے تھے آدمی تجربہ کار اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حال کے آبلے میں مستقبل کے واضح صندوق دیکھ لئے تھے وہ کشتیاں جلا کر یہاں آیا تھا یعنی اس نے اپنی تھوڑی سی شہری جائیداد فروخت کر دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ مقام پر رہائش پذیر ہو گیا تھا اس نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اراضی پر اپنی ملکیت جمالی تھی۔ ہمیشہ پاس تھا غریب لوگوں کو اپنا مزارع بنا لیا اور اس طرح اس کی دولت اور ذاتی وجاہت میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔

گاؤں کے لوگوں کی ترقی و ترقی آبادی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بابا صاحب کے مزار پر جا کر چراغ جلائے کی شرط پوری کرنا بہت مشکل ہے اس لئے وہ لوگ ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اپنے کٹھن سفر پر روانہ ہو جاتا

تھا لیکن جو تھے پانچویں چراغ کے بجھ جانے پر اس کی اپنی طبیعت اس طرح بھجھ جاتی تھی کہ وہ پھر زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا البتہ شہر سے کوئی نہ کوئی آنکاری رہتا تھا اور جو بھی آتا تھا وہ سیدھا نامرخان کی حویلی کی طرف جاتا تھا اور نامرخان اس وقت اس کے رہنے پر کاتبہ دست اپنی حویلی میں کویتا تھا اور پہلے دن کے بعد اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ مہبان دور میں جمعراتیں ہی یہاں بسر کرے گا اور جاتے ہوئے ملے گا بھی نہیں۔

بیسے میں ایک درخت آرا ضرور آجاتے تھے۔ کوئی مرد تو شاخ ہی آتا تھا۔ عام طور پر عورتیں اور وہ بھی عمر رسیدہ آتی رہتی تھیں مگر اس مرتبہ ایسا ہوا کہ تین بیسے گزر گئے اور نامرخان کی حویلی کے بڑے پھانگ پر کسی نے بھی دستک نہ دی۔ نہ جانے گاڑاں والوں کو اس سے اپنی اجتماعی زندگی میں ایک خلیکیوں محسوس ہونے لگا تھا جو پال میں جب بھی کچھ لوگ بیٹھتے تھے تو ہیر رانجیا یا زرخون نامہ سننے سے پہلے اس کی کاتبہ ضرور کرتے تھے اور نامرخان کے خشی منظورے کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا چنانچہ اس نے حویلی کے چوکیدار سے کہہ دیا تھا۔

چاچا دات کو آرام سے سو جایا کہ بابا صاحب کے مزار پر کوئی نہیں آئے گا۔

یہ چوکیدار چاچا مرزد نے یہ بات پہلے ہاندھ لی تھی۔ وہ اس امر سے بے نیاز ہو گیا تھا کہ جمعرات کو کوئی شخص مٹی کا چراغ اور مپس لے کر حویلی سے نکلے گا اور آدھ رات سے پہلے پہلے لوٹ آئے گا وہ پھانگ کے پہلو میں رکھے ہوئے رخ کے اوپر بیٹھے اور گھسنے لگتا تھا اور ہیر اور گھسنے اور گھسنے سے سو جاتا تھا۔

جو تھے بیسے کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جاگیردار نامرخان اپنی سفید گھوڑی سے نیچے اتر اور بے مرزد کے حوالے کر کے پھانگ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بوڑھا نے جس کا لباس سیلا نکھلا تھا اور جس نے ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا پھانگ کے پاس ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

نامر خان بارہم ایسے لوگوں سے بھاگ کے سامنے مل چکا تھا اس لئے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی وقت نہ ہوئی کہ یہ عورت کس مقصد کے ساتھ آئی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے۔
 "ٹھیک ہے۔" نامر خان نے رٹا دیا یا جلد بوڑھیا کی طرف پھینک دیا۔

نامر خان جب یہ جلد زبان سے نکالتا تھا تو اسے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی جو کیدار بہانہ کر کے اسے حریفی کے ایک کمرے میں پہنچا دیتا تھا اور اس وقت اس کے قیام تک کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔

نامر خان پھاٹک کے اندر چلا گیا تھا۔ معمول کے مطابق بوڑھیا کو جو کیدار کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانا چاہیئے تھا مگر وہ وہیں کھڑی رہی ایسا پسے کبھی نہیں ہوا تھا تو اب کیوں ہو رہم تھا۔ نامر خان چند قدم چل کر رک گیا۔
 "ہرزد؟" اس نے جو کیدار کو پکارا۔

جو کیدار نے بوڑھیا کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چلنے لگی۔

نامر خان نے پھاٹک کے اوپر چلتے ہوئے سو پارہ کے بلب کی روشنی میں بوڑھیا کو دیکھا۔
 اس چہرے میں اسے ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ ایسی کیفیت اس نے اس بھولن کے چہرے پر بھی دیکھی تھی جو مزاد پر ساتواں چرخہ جلا کر اپنی مراد پا چکی تھی۔
 "تو کون ہے؟" جاگرواد کے لہجے میں گڑبگڑ تھی۔

"میں میں۔" بوڑھیا اس ہی لفظ کہہ لگی۔

وہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اماں! تو کتنی کیسا ہے؟"

"پنیر میں تو میں؟"

نامر اس کے قریب آ گیا۔

"تو بھی؟"

بوڑھیا اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

”ماں تو بھی ساتواں چراغ جلائے گی۔“

بوڑھیا کا چہرہ جو پہلے تذبذب کا نشانہ لگے ہوئے تھا اس پر ایک ایسا نور جھلکانے لگا جو طلوع آفتاب کے وقت مشرقی افق پر تھوڑی دیر کے لئے برقرار رہتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

نامہر خان چند لمحے وہاں ٹھہر کر چلا گیا۔

بوڑھیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سب سے پہلے مٹی کے ان چند چراغوں پر پڑی جو ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے اوپر بڑے تھے چراغوں کے پاس کچھ روٹی بھی نظر آ رہی تھی۔

میز کے علاوہ کمرے کے اندر ایک چارپائی بھی تھی۔ مین کا ایک لونا، ایک دنگی اور اس قسم کی گھر بٹو استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

جو کیدار بجلی کا بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھیا دروازے کے قریب تک کر کے کاجا نکلی بی رہی، اس کے دل میں ایک ہیجان سا رہا ہو گیا۔ اس نے اپنا تھیلہ میز کے اوپر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں ان چراغوں کو چھونے لگیں جن میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے یکایک خیال آیا کہ جو بھی یہ چراغ لایا ہو گا وہ کتنی اس کے ساتھ آیا ہو گا اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا ہو گا۔

اسے اپنا خیال آ گیا۔ وہ ایک ایسے کپڑے کی طرح تھی جس کو دھو کر پوری طرح اس کا پانی نہ چھوڑا گیا ہو اور اس حالت میں سبز گھاس پر بکھیر دیا گیا ہو۔

دھوپ کی شدت کپڑے کے اس باقی پانی کو بھی چوس لے گی۔

اس کا سر گھونٹنے لگا اور وہ چارپائی پر گرنے ہی والی تھی کہ جاگیردار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہاں تو بھی ساتواں چراغ جلائے گی۔ اور اس کے باطن میں پھر ایک

اضطراب پیدا ہو گیا۔

جمعرات آنے میں دو دن باقی تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے پھٹیلے میں سے ساری ہیزیں میز پرائٹرل دیں۔ ان میں کڑوے تل کی ایک بڑی بوتل تھی۔ دس بارہ نئی کے چراغ اور دوئی کا ایک بندل۔

جس وقت وہ تھوڑی تھوڑی روٹی لے کر تیاں بنا رہی تھی تو ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں، سچی دواڑے کے اندر اپنے چھوٹے سے جدی مکان میں ہے اور ہڈی جو ہے پر رکھ کر ہانے موڑے ہوئے پر چٹھی دواڑے کی طرف ٹنگی بازو کر رکھ رہی ہے جہاں وہ جبرہ نظر نہیں آتا جو نو سال پہلے غائب ہو گیا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا چراغ دین ہی اس کا واحد مہار تھا۔ بارہ سال تک وہ بڑا ذمے دار بیٹا بنا رہا۔ ماں کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی۔ محلے کے میسوں گھروں تک جانا، وہاں سے پیسے کپڑے لانا، ہر پہننے ان سب کپڑوں کی لڑیاں بنا کر دیا پر لے جانا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر انہیں دھونا اور پھیل ہونی دیرت پر سکھانے کے لئے پھیلا دینا شام کے بعد انہیں اپنے بیل پر لاد کر گھر لے آنا اور دات کو گیارہ بارہ بجے تک ان پر اسٹری پھیر کر الگ الگ گاہکوں کے کپڑے نہ کر کے رکھ دینا اور دوسرے روز صبح سے سنے کر قہرے پر ہر تک گھر گھر کپڑے بیچا کر اجرت وصول کرنا۔ یہ سب کام وہ بڑی ہمتاءگی کے ساتھ کرتا رہتا۔ ان سب کاموں میں اس کی ماں بھی برابر اس کی مدد کرتی رہتی تھی مگر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ماں کی بوڑھی ہڈیوں کو تکلیف دے۔

تیرھواں سال شروع ہوا تو نہ جلنے کے طرح سے اسے جوئے کی لت پڑ گئی کئی دن اور کئی راتیں حوالات میں بھی گزار دیں۔ لیکن یہ لت دور نہ ہو سکی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ ایک رات وہ بڑی دیر سے گھوم آیا۔ صبح اسے ایک مہمان نے بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لئے پولیس آ رہی ہے۔ اس نے ابھی کچے کا ایک پی ٹیو وی میں تھوڑا کرتی سے اتار دیا کہ جلدی سچاؤں میں

جوتے ٹال کر بیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ماں پیچھے آوازیں پی دیتی رہ گئی۔
اس کے بعد اس کی ماں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور مسرت بخش وہ لمحے ہوتے تھے جب وہ دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کے بیل کی گھنٹیوں کی آواز سنا کرتی تھی۔ یہ بیل شام کے بعد واپس گلی میں داخل ہوتا تھا اور گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ عیزی سے دروازے پر کھڑی ہوتی اور جب تک ایک ایک کر کے ساری لڑکیاں اندر رکھوا نہیں لیتی تھی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔

وہ سارے کام مزے لے لے کر کرتی تھی استری میں سے کچی پکی داکھ باہر نکالتی تھی۔ لمبے چوڑے تختے پر جس کے اوپر ایک ایک کپڑا بچھا کر استری کی جاتی تھی۔ اس کی چادر بدل دیتی تھی کونٹوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لیتی تھی کہ ان سے کام چل سکتا ہے یا نہیں، نیم سوختہ کو نئے رکھ کر باقی داکھ لے کر باہر پھینک دیتی تھی۔

چراغ ابھی گھر سے دور ہی ہوتا تھا کہ وہ صحتے جاواں ساری جاواں کہہ کر اس سے جا کر لپٹ جاتی تھی۔

مگر پچھلے نو سال سے اس کے گھر میں اور اس کے دل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں بھا بھکی تھیں۔ اپنے بیٹے کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سیانوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر چکی تھی مگر اب وہ تھک چکی تھی۔ بالکل ایسے ہو چکی تھی کہ اس نے بابا صاحب کی کراست کا حال سنا اوروہ اسے آخری سہارا سمجھ کر جاگیر دار کے یہاں آ گئی۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور اس کی انگلیاں متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

”اتنی ساری بٹیاں۔ اپنا رڈا لے لے؟“

یہ الفاظ جاگیر دار ناصر خان نے کہے تھے جو شاید جب سے حویلی بنی تھی تیسری مرتبہ اس

کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بوڑھیانے ایک نظر بیٹوں پر ڈالی اور پھر ناصر خان کو دیکھنے لگی جس کی مونچھوں کے بال ہلکے کر ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میں نے سنا ہے تمہارا بیٹا نو سال سے غیب ہے۔“

بوڑھیانے اثبات میں سر ہلادیا۔

ناصر خان چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے بوڑھیانے پوچھا۔“

”فاطمہ؟“

”فاطمہ ناصر خان نے چند سیکنڈ بوڑھیانے کو گھور کر دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔“

”کوئی تکلیف؟“

بوڑھیانے نفی میں سر ہلادیا۔

کمرے سے باہر ناصر خان کا منشی اکتھ میں حساب کتاب کے لیے بے وجہ ٹلے اپنے ایک کے خدشہ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ناصر خان کی اس پر نظر پڑی تو دروازے کی طرف جانے لگا۔ جمعرات کی شام کو جھکڑ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ بوڑھیانے چراغ میں جتنی اور تیل ڈالا اور سے اکتھ میں ماچس پکڑی بسم اللہ کہہ کر جہاز کی طرف روانہ ہو گئی۔

کساہی کھیتوں سے لوٹ رہے تھے اور ان کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بوڑھیانے قدحوں میں تیزی آگئی۔ بسنسان راستوں سے گزرتی ہوئی وہ مقبرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے وقت بھی اس کے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز گونجنے لگی تھی اور وہ ان سراہی ہواؤں سے بے نیاز تھی جس کے جھونکے مقبرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مسلسل شور مچا کر رہے تھے۔ اس نے بجلی کو ماچس کے کنارے پر دگڑا۔ آہستہ سے اسے جتنی کی لو کی طرف بڑھایا۔ ایک

ہنگی سی مدھنی پھوٹ پڑی۔ جلتا ہوا چراغ اس نے مزار کے ایک طرف رکھ دیا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور چند لمحوں بعد انگلیوں سے دُعا دوں پر پڑتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کر کے جلتے ہوئے چراغ پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

وہ قدم اٹھا رہی تھی مگر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ یہ ایک حرکتی کے جو کیدار نے حرکت پہلے میں پرچھا۔

”کیا ہوا الٹی صاب؟“

بوڑھی نے اپنی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور پچانک میں سے نکل گئی۔

کمرے میں جا کر اس نے باجس میز کے اوپر رکھ دی چادر پانی پر جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس وقت دلوں جا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ہنگی ہاتھ کر ادھر دیکھنے لگی۔

دوسری دوسری اور پھر چوتھی جمعرات بھی گزر گئی اور باوجود خال کے سرد جھونکے اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔

پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھنی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اس احساس کے باوجود اس کے قدم آلود ہو نہٹ اُڑتے رہے۔

دونوں ہاتھ سپر پیر کر دیے۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے گرد دوپٹہ پٹا ہوا تھا۔

دو تین لمحوں کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ہو نہٹ اُڑتے رہے اور پھر دونوں کی نظریں بچک گئیں۔

بہا سند تیز تھی۔ لو پر کسی اثر نے ہونے پر مذے کی صحیح فضا میں تحلیل ہو گئی۔ وہ جب حویلی کے پھاٹک پر پہنچی تو اس مرتبہ جو کیدار برڈ نے کوئی سوال نہ کیا اور پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے چار ہائی پرلیٹ کر خود سے سوال کیا۔

”کوئی ہوگی۔ میری طرح بد نصیب۔ دیکھا دیتی۔“

چھٹی جمعرات کو وہ بابا صاحب کے مزار کے پاس پہنچی تو اسے مزار کے پہلو میں ایک جلتا ہوا چراغ نظر آیا۔ اس چراغ کے ساتھ پانچ اور چراغ تھے جو کچھ چمکے تھے مگر گنتا تھا اس چھٹے چراغ کی نو سے جو دم سی روشنی پھوٹ رہی ہے وہ ایک روشن ٹیکری طرح ان کے اوپر پھیل گئی ہے۔ اس نے اپنا چراغ جلا دیا اور چراغوں کے پہلو میں رکھ دیا اور جب دونوں ہاتھ پھیلا کر سیکڑوں بار دہرائے ہوئے الفاظ اپنے چوڑوں سے نکالنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اپنی جھولی کے کناروں کو پکڑ لیا اور آنسوؤں پر اس کی جھولی میں گرنے لگے۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ اس کا چراغ جل رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا چراغ بھی جلتا تھا۔ اس نے یکایک غموں کی کہ دونوں چراغوں کی تریں اس کے آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی آنکھوں کے اندر چلی جا رہی ہیں۔

وہ دیر تک جھولی پھیلتے کھڑی رہی۔

اس رات وہ بڑی دیر تک دلوں میں بیٹھی رہی اور جب آغابہ سحر نمودار ہونے لگے تو مقررے سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے پلٹ کر دیکھا۔ خدا ناکا صلے پر دونوں چراغ دو ٹپکتے آخر ساتویں جمعرات آگئی۔

مذہب کی نماز کی اذان بلند ہوئی تو اس نے چراغ بجای دی اور باپس سنبھالی اور صبح نماز کے چلنے لگی۔

اد پر ستارے چمک رہے تھے اور ہوا خامی تیز تھی وہ خاموش ویران راہ پر قدم اٹھانے
مقررے کی طرف جا رہی تھی۔

کسی قریب علاقے میں شہر بادش ہونی تھی جس کا پانی بہتا ہوا تیشی حصوں میں آکر جا بجا ٹھہر
گیا تھا کہیں کہیں یہ پانی زیادہ گہرا تھا اور اسے بڑی شکل سے آگے بڑھنا پڑا تھا۔

جب وہ مزار کے قریب کھڑی تھی تو اس کے دل میں ایک سیماں برپا تھا۔ اس کا ہاتھ
کانپ رہا تھا اور سانس جیسے سینے میں دگ سا گیا تھا۔

اس نے ماہی کی ریل جلدی، چراغ کی ٹوکی طرف بڑھائی اور چراغ روشن ہو گیا۔

یہ چراغ آہستہ آہستہ مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس
کوئی کھڑا ہے۔ ایک آہ اس کے کان تک جا پہنچی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ مزار سے کچھ اوپر ایک بیجا ہوا یاد اور اس سے ذرا ناسطے پایک
ایسا چہرہ جو اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس پر کتے کا عالم طاری ہو۔ ایک گرم گرم لہر اس کے
سارے جسم میں سرایت کر گئی۔

اس کا ہاتھ مزار کی طرف حرکت کرنے کی بجائے اوپر جانے لگا۔ دوسرے لمحے میں بیجا ہوا
چراغ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس کا جلتا ہوا چراغ اس کی دوسری عورت کے ہاتھ میں
جو ایک کھنڈ کی دیوار کی طرح ٹھکی ہوئی تھی۔

تین چار لمحوں ہی میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

بیجا ہوا چراغ لے کر وہ ایک سیکڑ بھی دہاں نہ بھری۔ مقررے سے باہر آگئی اور مشرق کی
طرف چلنے لگی۔

ہوا کے متعدد جز تجبیرے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ بار بار اس کے قدم ٹکھڑا جاتے تھے

مگر وہ برابر چلی جا رہی تھی تاکہ ہی آگے کسی منزل کا تصور نہ کرے بغیر جیسے دور سے کسی نے اسے لٹاؤ
کر دیا ہو اور وہ کہیں بھی لڑکنا نہ چاہتی ہو۔

پھر بادش ہونے لگی اور بادش کے بھاری بھاری قطرے چراغ کے کناروں پر اور چراغ کے اندر گرنے لگے جب یہ قطرے چراغ کے کناروں سے لگتے تھے تو رن کی ہلکی سی آواز آنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پچیاں بھیل گئیں اس کے تھکے ہوئے ضعیف پاؤں میں ایک نامعلوم سی قوت آگئی۔

بادش کے قطرے گر رہے تھے۔ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ رن رن رن رن۔ وہ کہیں بھی نہ لڑکی یہ جزو تند ہوا میں برابر چل رہی تھیں۔ بادش بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر لڑکیں ہو کر بادش ختم گئی مگر ہواؤں کی تندی و تیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کو لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ان کے قدم رک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھیا چلی جا رہی ہے اور طوفانی ہواؤں میں اس کے ہاتھ میں تھا ہوا چراغ جل رہا ہے۔ بوڑھیا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس نے چراغ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی نہیں دیکھا تھا وہ چلی جا رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں اور سچے جہان دوسرا سید لوگ قدم اٹھا رہے تھے۔



یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے وسطی حصے میں ایک نو تعمیر شدہ مقبرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔

قصبے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں ایک بزرگ خاتون دفن ہے جس کا چراغ طوفانی ہواؤں میں بھی جلتا رہتا تھا۔ اس لئے اسے چراغ بی بی کہتے ہیں۔ ہر روز عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے گم ہو گئے ہوں۔

مزار کے سر ملے ایک مٹی کا چراغ ساری رات جلتا رہتا ہے۔

گریٹ مین

قدوسی رات سے کچھ زیادہ وقت گزرا ہو گا کہ نور اس اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں اندھرا دھند دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس تاریکی میں کسی ایسی کرن کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے۔

یہ پہلی رات نہیں تھی جب وہ اس درجہ بے تاب ہو گئی تھی کہ قدوسی رات سے زیادہ یٹ ہی نہیں سکی تھی۔ ایسی کئی راتیں آئی تھیں اور ان راتوں میں یا تو وہ سارا وقت کوٹھیں بدلتی رہی تھی یا اٹھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر ایک لمحے کے لئے بھی سو نہیں سکی تھی۔

وہ ایک غریب بیوہ تھی دنیا میں اس کا کوئی بھی سہارا نہیں تھا گھر کا خرچ چلانے کی خاطر دھولے کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا اسے دکھ ضرور تھا مگر یہ کوئی ایسا دکھ نہیں تھا کہ وہ پوری پوری رات آنکھوں میں گزاردے اس کے دکھ کی اصل وجہ اس کا بیٹا تھا جسے سب سال کا نواب جو اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نواب سے اسے بے شکایت نہیں تھی کہ وہ کچھ چڑھ کچھ نہیں سکا تھا کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا گھر کی ذمہ داریوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا ایسی باتوں کا گلہ تو اسے اس وقت ہوتا جب نواب ایک نادر مل انسان ہوتا اور وہ نادر مل انسان تھا ہی نہیں۔

ہاں نے جب اس کا نام نواب رکھا تھا تو وہ غیر ضروری طور پر چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کہ دولت مند بنے آپ کھائے ہاں کو کھلائے اور وہ نواب تو بڑا مگر خیالی دنیا کا، اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا آدمی ہے اور سب کے سب اس کی عزت

کرتے ہیں احترام کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں وہ خود کو گریٹ مین تصور کرتا تھا اور یہ اس بناء پر کہ چراغ دین ٹھیکیدار کا بڑا لڑکا جو کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے نواب کو بتایا تھا کہ تم گریٹ مین ہو یہ لفظ سن کر نواب ہونٹوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا۔
 ”ارے یہاں تم گریٹ مین ہو۔ گریٹ مین کا مطلب ہے بڑا آدمی، تم بڑے آدمی ہو یعنی گریٹ مین ہو۔ سمجھے؟“

نواب نے یہ لفظ یاد کرنے تھے اور انہیں بلا عمل اور بلا ضرورت اپنے ہونٹوں پر لے آتا تھا محلے میں اکثر لوگ مذاقاً اسے گریٹ مین کہہ کر ہی پکھڑے تھے اور اس طرح پکھڑے جانے پر وہ بھولا نہیں سکتا تھا پہلے پہل ماں نے سوچا تھا ابھی چھوٹا ہے۔ یہ نہیں سوچ سکتا کہ لوگ گریٹ مین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جب بڑا ہو جائے گا تو اصل حقیقت سمجھ لے گا مگر اس کی یہ اسیدناک میں مل گئی کیونکہ نواب وہ مردوں کے مذاق کو مذاق سمجھ ہی نہ سکا وہ خیال کرتا تھا کہ محلے کے چھوٹے بڑے جو مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر اس کو سلام کرتے ہیں اور گریٹ مین کہہ کر غائب کرتے ہیں تو یہ سب کے سب واقعی اس کا احترام کرتے ہیں اور حقیقتاً اسے گریٹ مین ہی تصور کرتے ہیں اور یوں وہ زیادہ سے زیادہ انا پرمل ہوتا چلا گیا۔

نوراں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا جشک ایک پھوٹی کوڑی کی کا کہ گھر میں نہ لائے دن بھر بے کار بیٹھا رہے مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کام کرنے کے لئے جس گھر میں بھی جائے گھر کے لوگ ہنس نہیں کر اس سے پوچھیں۔

”نوراں! کیا حال ہے تیرے نواب کا یہ تیرا گریٹ مین کیا کر رہا ہے۔“

وہ اس طرز کو خوب سمجھتی تھی اور یہی احساس اس کے لئے اس قدر اذیت ناک ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا چاہتا تھا۔ کاش اس کا بد بخت بیٹا سر جائے تاکہ بروڈ اس سے نہ ہر کے گھونٹ تو نہ پینے پڑیں۔

محلے کے بڑے آئے دن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات کر دیتے تھے اسے کسی غفلت میں صدر

بنایا جاتا تھا اور جب وہ بیٹھے گلتا تھا تو کرسی کھسکا کر اسے گرادیاجاتا تھا اور پھر مٹائی لٹک لی جاتی تھی۔ اسے ایسی مٹھائی کھلانی جاتی تھی جس میں ٹمک بھرا ہوتا تھا اس کی شان میں اپنے قصبے پر بھے جاتے تھے جن میں اس کا بی بھر مٹائی اڑایا جاتا تھا لیکن وہ تھا کہ اس سارے مذاق کو اپنی شان میں اظہار عقیدت ہی سمجھتا تھا۔

اگلے دن اس کے گلے میں ایک بڑا سا بار ڈالا گیا تھا۔ جس میں پھولوں کے ساتھ کپڑے میں پٹی ہوئی کوئی شے بھی تھی۔ قراب یہ دیکھیں کہ بڑی آن ہاں شان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے جب وہ گھر کی دروازہ پہنچا تو اس نے اس کا ہار نوچ لیا اور کپڑے میں لپٹا پرانا جوتا نکال کر اسے تالیاں بجانے والے بچوں پر دے مارا اور کم از کم آدھ گھنٹہ تک انہیں بد عابثی دیتی رہی۔

اس کا ریشا کا حق ہو گیا ہے کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اسے ذلیل کر رہے ہیں یہ بات اس کے لئے سوا ان درج بن گئی تھی اور وہ اپنی عزت کے احساس سے اندھ کی اندھ لگ رہی تھی مگر اس کا بے چارہ شاخا کر ماں سے لڑا رہا تھا۔

• ماں تو پاگل ہو گئی ہے یہ میری عزت کرتے ہیں۔

• عزت کرتے ہیں عزت کرنے کے لئے گلے میں جوتے ڈالے جاتے ہیں؟ اور اس نے بیٹے پر اس زور سے دو جھڑا مارا کہ وہ ہلا اٹھا۔

نورماں کے گھر میں جب بھی ایسا ہنگامہ مچا ہوتا تھا تو عموں ماں بسائی بھاگتی ہوئی آ جاتی تھی اور وہ وہی غصہ کہتی تھی جو وہ کئی بار کہہ چکی تھی۔

• نورماں وہ تو بنگلہ ہے، تو بھی پاگل ہو گئی ہے۔

اور نورماں اس کے جواب میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولا کہ پردہ دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔

• اللہ اسے کسی کی آئی آجانے والے اٹھائے۔

اس دن بھی اس نے یہی دعا کی تھی اور نواب یہ کہہ کر دروازے میں سے نکل گیا تھا۔
اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا:

مگر حسب معمول وہ غلام کو گھرا لیا تھا اور اس وقت اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

خدا کے ذہن میں تلخی بھر گئی۔ اس نے چار پانی سے نیچے اتر کر گھوٹے میں سے ٹھنڈے پانی سے مٹی کا وہ پیالہ بھرا جس سے گھوٹے کوڑا جانا گیا تھا۔ سرد پانی جب اس کے حلق سے نیچے اترتا اسے ذرا سا سکون مل گیا۔ مگر یہ ممکن حادثہ تھا کیوں کہ اسے پھر ایک بات یاد آگئی تھی جس نے اسے تباہ کر رکھا دیا تھا۔

میاں نور محمد کے ہاں جو عورت برتن مانجھا کرتی تھی وہ بیمار ہو کر اپنے گھاؤں چلی گئی تھی اور میاں صاحب کی بیوی نے خوراک کو کھوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے ہاں کام کیا کرے۔ خوراک کو تو کام کرنا تھا۔ لیکن بھی یہ وہ میاں صاحب کے ہاں چلی گئی۔

جس لمحے وہ رالان میں سے گزر کر کمرے میں پہنچی میاں صاحب اپنی پگھڑی داڑھی میں لگھئی پھر رہے تھے۔

خدا نے سلام کیا۔

”دیکھ اسلام، خوراک بہن! کیا حال چال ہے؟ میاں صاحب نے لگھئی میز پر رکھ کر سرور دانی اٹھائی اور آنکھوں میں سرور ڈالتے ہوئے یہ سوال کیا۔

”اُف! کاشکے میاں جی؟“

”ہاں شکری ادا کرنا چاہیے۔۔۔ پر بندہ بڑا ناشکرا ہے۔“

”جی میاں جی“

”کیا کام ہے خوراک بی بی؟“

”وہ جی آپ کی بیگم نے بلایا ہے۔ ناظر بیار ہو کر چلی گئی ہے ناں۔“

میاں صاحب نے خوراک کو ذرا غور سے دیکھا۔

”تو تم غلط کی جگہ کام کرو گی؟“

نوراں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”پر نوراں بہن! چیز ایسا تو گریٹ مین ہے۔ گریٹ مین کہ مائیں وہ سڑک کے برقی انیس
انہجھا کرتیں؟“

نوراں کے ذہن میں جیسے شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ اور اس شعلے کی حرارت اس کے سارے
بدن میں سرایت کر گئی۔

میاں صاحب مٹکا کر اسے دیکھ رہے تھے یہ مکالمہ اسے زیر لگی اور وہ ایک لمحہ بھی
وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اس وقت وہ خاموش رہی تھی۔ مگر اب جو اسے یہ بات یاد آگئی تو وہ میاں
صاحب کو بددعاؤں دینے لگی۔

میاں جبراجانہ اٹھے۔ تجھے سانپ ڈس جائے۔

وہ بددعاؤں دے رہی تھی اور اس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں اس طرح اثر
رہے تھے جیسے ان میں گرم گرم تیل ڈالا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اس نے بھرا ہوا پیالہ ہونٹوں
سے لگا لیا اور تین چادر لیے لمبے گھونٹ بھرے۔ آدھا پانی ٹھوڑی پر سے گزندہ گردن کو چھوتا ہوا
عمر بیان تک جا پہنچا اور وہ پیالہ ہاتھ میں لئے لبرخی سانسے دیا کہ گھوڑی رہی۔

آسمان میں ستارے جھکی جھکی روشنی دے رہے تھے اور ہر طرف سناتا چلایا ہوا تھا ایسے میں
جب میاں نور محمد کے کوٹھے سے مرنے کی گلگڑوں کوں کہتی ہوئی آواز بلند ہوئی تو اسے احساس
ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

مرزا باگ پر باگ دے دم تھا اور نوراں کلابی چاہتا تھا کہ وہ اگر اس کے قریب ہوتی تو
اس کی گردن ہی سوڑ ڈالتی۔ اس نے میاں صاحب کی بیوی کو دل ہی دل میں نکالیاں دے دیں
نے اسے پال پوس کر اتنا طمخور بنا دیا تھا کہ اس کی آواز بچے میں ”وو۔ وو۔“ تک گونج اٹھتی تھی۔

نوراں کو معلوم تھا کہ جب مرزا باگ دیتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر بعد مسجد سے آذان کی

آواز بھی آنے لگتی ہے مگر اس صبح صرف مرغابی ساری فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اذان کی آواز نہیں آتی تھی۔ شاید مؤذن سو گیا تھا یا مرنے نے وقت سے پہلے ہی لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

نوراں گھڑے کے پاس کھڑی رہی۔ پیالہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پیالہ اونڈھا کر کے گھڑے کے منہ پر رکھ دیا اور پھر برآمدے کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کمرہ نواب کا ڈرائنگ روم بھی تھا۔ کامن روم بھی اور خوابگاہ بھی دیواروں پر پرانے کیلنڈر، انگریزی اور دیسی اکوٹرموں کی تصویریں اور وہ دارنگے مہئے تھے جو نواب کے بزمِ خورشید عقیقت مندوں نے خاص خاص موقعوں پر اس کے گلے میں ڈالے تھے ان کے پھول مرجھا کر ذروں کی صورت میں نیچے گرے ہوئے تھے۔

نوراں نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چار پائی کے نیچے فوجی بوٹ پر پڑی۔ یہ بھاری بھر کم بوٹ غلام احمد قریشی عراف کے بیٹے نے نواب کو دے دیے تھے اور یہ کہہ کر دیئے تھے کہ گریٹ مین۔ ایسے بوٹ ہی پہنا کرتے ہیں۔

نواب کو بھلا ایسے بوٹ پہنے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی شان سے بوٹ لئے شدید گرمی کی وجہ سے اس کو عسوی ہوا جیسے اس کے پیروں کو گرم گرم ٹکینے میں کس دیا گیا ہے لیکن گریٹ مین کو تو سب کچھ کرنا ہی ہوتا ہے۔

اس کے پاس یہ طوفانک بوٹ کبھی کہہ کر نوراں کے اندر بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔
”تو میرے اللہ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اسی وقت اس کی نظر بیٹے کے چہرے پر پڑی اس کا چہرہ بیلا بیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس پر جا بجا پیسے کے قطرے جگ رہے تھے۔“

نوراں کو عسوی ہوا کہ اس کے بوٹ حرکت کر رہے ہیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔۔۔ نوراں کو سناٹی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ سوتے میں بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کرتا ایک

وہ بلاشبہ وہ دالان میں سویا ہوا تھا اس نے بیٹے کو بڑبڑاتے ہوئے پایا تھا اور جب اپنے مکان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی تھی تو اس نے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اماں! میں گریٹ میں ہوں۔ اماں! تم نہیں سمجھتیں میں کیا ہوں۔ گریٹ میں۔ گریٹ میں۔ اس نے منہ دھری طرف پھیر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھرے تنگی بانٹھ کر دیکھ رہی تھی۔

نواب کا ماتھا ٹھجا ہوا تھا اور پھر اس کے چہرے پر اڑ رہے تھے۔
نوراں بے قرار ہو گئی اور اس کے ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں بیٹے کی طرف بڑھنے لگے اس نے دور دور سے اس کے کندھوں کو ہلایا۔ نواب نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔
”کیا ہے اماں؟“

”مردار منہ پھینکھیاں اڑ رہی ہیں۔“

نواب نے زہرناک نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”اماں! تجھے ہزار بار کہا ہے، ذرا ادب سے بات کیا کرو۔“

”کیوں دے ادب سے بات کیوں کروں۔ تو میرا جنا ہے یا تو نے مجھے جنا ہے؟“

”اماں! نواب لے ہاتھ سے چھوڑ کر ہٹاتے ہوئے کہا تو جانتی نہیں میں گریٹ میں ہوں تو راں نے دور سے زمین پر تھوکا۔“

”کچھ نصرت بری گریٹ میں پر۔ سب تجھے کھول کرتے ہیں۔ تو نے تو میرے گھر کی خاک

اڑا دی ہے۔“

نواب اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی آنکھیں ہاتھ پر پھیر رہا تھا۔

اماں تو نہیں مانتی۔ میں گریٹ میں ہوں۔ گریٹ میں۔ بڑا آدمی۔ لوگ میری عزت کرتے ہیں مجھے دیکھتے ہیں تو نورا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنا تو نے۔ لوگ چھٹاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسی وقت اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں گریٹ میں ہوں۔ اسی عزت گریٹ میں ہی کی کی جاتی ہے۔ نواب کا چہرہ جوش بیان سے مٹھ پرگی تھا اس کے تھے تھکے اور وہ اس

وقت بڑا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا پھر نہ جانے کیوں ماں کی مناجاگ اٹھی۔ اسے اپنے بیٹے کا وہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو برسوں پہلے اس کی چھاتی سے دودھ پیتے پیتے چھاتی پر دانت لگ دیتا تھا اور وہ دودھ سے بے قرار ہو جاتی تھی۔ چھاتی اس کے منہ سے نکال لیتی تھی۔ لیکن جب وہ دودھ لگتا تھا تو اسے سینے سے چٹا کر پھر چھاتی اس کے منہ میں ڈال دیتی تھی۔ اس نے اپنا ماتھ بڑھا کر اس کے سر کے سخت بالوں پر پھیرا اور یہ احساس کر کے کہ ان بالوں میں تیل نہیں لگایا گیا اس کا دل اور دکھی ہو گیا۔

”نہ نہ نہ پڑ نہ۔“

نواب کچھ کچھ میزبان سے دیکھے جا رہا تھا۔

”تو سمجھتا کیوں نہیں۔ اللہ ان کو سانپ کاٹے۔ ان کے جاذبے نکلیں۔“

نواب جانتا تھا کہ اس کی ماں کن لوگوں کو بددعا میں دے رہی ہے۔

”نہیں لالہ۔ وہ میری عزت کرتے ہیں۔ وہ بولا۔“

”نہیں کرتے۔ تیرا کھول اڑاتے ہیں۔“

نواب نے اپنا ماتھ بیٹھے کے سر سے ہٹا لیا تھا۔

”اماں! وہ آج میرا جلوس نکالیں گے۔ میرے گلے میں۔“

”جو عورتوں کے ہار ڈالیں گے۔ منہ پر تھوکیں گے۔ زور زور سے نہیں لے چھتے لگاؤں گے۔“

بے شرم۔ بے حیا۔“

دودھ پھونکانے کے لئے اس کے ماتھ اوپر اٹھے اور پھر وہ پس آ گئے۔

”اماں تو پاگل ہو گئی ہے۔“

نواب کے ہونٹ تھرتھرا لے گئے۔

”وہے میں پاگل ہوں کہ تو پاگل ہے۔ تیرا دماغ پھر گلیبے عزت بے عزتی میں فرق ہی نہیں

کرتا۔ اللہ تجھے کسی کی آنی آنے سے بچے ہیضہ ہو جائے۔“

بیٹے بھٹ کے اختتام پر وہ اسی قسم کے غمزے کہتی تھی اور بار بار ہاتھ پر ہاتھ مار کر قسمت کو کو سنی تھی۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر فوراً پلٹ آئی۔

”میں کہتی ہوں تو آج گھر سے نہیں نکلے گا اس نے حکم دے دیا۔“

نواب سر ہلانے لگا گویا کہہ رہا ہے: جو دل میں آئے کہہ دے ہو گا وہی جو میں پسند کرتا ہوں۔

”میں کہتی ہوں تو گھر سے نہیں نکلے گا ورنہ۔“

”میرا جنازہ نکلے گا: نکلے گا! جنازہ ہی نکلے گا۔“

وہ برداشت نہ کر سکی نواب پر ہل پڑی اسے دھکاک دے کر چارپائی پر گر ادرا اور اس کے ہاتھ اس کے چہرے پر پڑے اور ہیٹ پر بستے رہے۔ ٹھک مار کر دروازے سے باہر نکلی۔ کدھی نکال اور مٹی لانے کے لئے میاں نور محمد کے گھر جانے لگی۔

اس روز وہ دیر بہر تک گھروں میں کام کرتی رہی اور یہ بھول ہی گئی کہ وہ نواب کو کمرے میں بند کر آئی ہے۔ وہ بچے کے گنگ بھگ وہ لوٹی شیخ اللہ شاہ کے گھر سے وہ تھوڑا نہیں جیتی تھی اپنا اور بیٹے کا کھانا لیتی تھی اور اس مزدور چار دیواریں اور ایک برتن میں سلگ لئے گھر میں نکلتی۔ وہاں اور وہاں کا جتنی اس نے چوڑھے کے پاس رکھ دیا۔ بند دروازہ دیکھ کر لڑنے دے میرے رہا۔ اس کے منہ سے نکلا اور جھڑپی سے اس نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ نواب چارپائی پر آٹھ گھنٹیں بند کئے پڑا ہے۔

”نواب دے نواب؟ اس نے بیٹے کو پکارا۔“

نواب نے کوئی حرکت نہ کی۔

”کیا مزے سے سو رہا ہے؟“

نواب پر اس غمزے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

خود اس نے کنگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ایک سخت اسے غصوں پر اسے اس نے اپنے بیٹے کا

ہاتھ نہیں چرلے پر رکھا ہوا اترا پکڑ لیا ہے۔

وہ ڈر گئی۔

نواب پڑ نواب

نواب نے آنکھیں کھول دیں۔

جلوس والے آگئے ہیں، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے دکھنا کر گر پڑا۔

تین دن گزر گئے اور اس کا جنازہ اٹھا، چوتھے روز وہ میوش ہو گیا اور اس کے خٹک ساتویں روز بعد وہ چارپائی کے اوپر ایک بے حس و حرکت، نحیف و زرا و جسم کی صحت میں پڑا تھا۔
نواب مر گیا۔ نواب مر گیا۔

ہر شخص وہ سوسے سے کہتا تھا، دراصل وہ دوسرے کو یہ خبر سنار ہا تھا کہ غلے کی تفریح کا ایک بہت بڑا اور یہ ختم ہو گیا ہے۔

نوریاں خاموش تھیں، اس کے سامنے اس کے بیٹے کو بھلایا گیا، کھنڈیا گیا، اس نے نذر زبان سے ایک لفظ کہا اور نہ آ نکھ سے ایک آنسو ٹپک بہا۔
غلے کی عورتیں منہ جوڑ جوڑ کر کہتی تھیں۔

”اے کبھی ظالم ماں ہے نہ روٹی ہے نہ مین کرتی ہے؟“

اور نوریاں بالکل نہ روٹی، غلے کی عورتیں اپنے سرے ہونے عزیز یاد کر کے روٹی توں۔

چار مردوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھایا اور قبرستان کی طرف چلتے گئے جنازے کے ہمراہ صرف سات آدمی تھے، اور ان میں چار جنازہ اٹھانے والے بھی شامل تھے آٹھویں ذلیل تھی جو اس طرح جل رہی تھی جیسے خواب میں قدم اٹھا رہی ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے سے اسے کسی نے بھی نہیں روکا تھا، دراصل اس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ گلے سے باہر نکل آیا۔

ابعد علی ٹھیکیدار کی حویلی میں کوئی تقریب تھی، حویلی کے باہر دس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے

انہوں نے جو جنازے کو آتے دیکھا تو سب کے سب استراٹھا کھڑے ہوئے اور اس نے انہیں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور یک لحظہ اس کے قدم رک گئے۔

اس نے خود سے اپنے سینے پر دو ہتھ مارا اور ہانے دے دے لوگو! میرا گریٹ مین مر گیا۔ ہانے دے میرا گریٹ مین مر گیا۔ اور یہ الفاظ کہتے ہوئے خود را کہ زمین کے اوپر گر پڑی۔

سائرہ

وہ ہسپتال پہاڑی علاقے میں تو نہیں تھا مگر پہاڑی علاقے کے بہت قریب واقع ہونے کی وجہ سے وہاں فضا عموماً سرد ہی رہتی تھی۔ اس لئے ہسپتال کا علاقہ سردی کے ساتھ ہی ہسپتال کے تمام کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیتا تھا۔ تاکہ ہوا کے خشک جھونکے کمروں کے اندر کمزور مریضوں کو پریشان نہ کریں۔ اور جب سردی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جاتے تھے تو کہیں بھی سردی کا کچھ زیادہ احساس نہیں رہتا تھا۔ لیکن علی نواز جو ہسپتال کے پہلے فوٹروم غیر سہ ماہی میں گزشتہ سوا چار ماہ سے مقیم تھا محلے کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے دونوں پنٹ کھلا رکھتا تھا جو اس کے سر لانے سے ڈیڑھ فوٹ کے فاصلے پر کھلتی تھی۔ شروع شروع میں نرس نے ڈاکٹر کی واضح ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہ کھڑکی بند کر دی تھی اور علی نواز نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ مگر جب دیکھ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ راڈنڈ پر آئی تھی تو اس نے کھڑکی کو کھلا پایا تھا۔ ڈاکٹر نے کھڑکی کھلی دیکھی تو نرس کو ڈانٹ بھائی۔ نرس نے اسی وقت کھڑکی بند کر دی جو چند گھنٹوں کے بعد ہی پھر کھلی گئی۔ مریض سے سوال جواب کرنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کھڑکی کو ہر وقت کھلی رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذور تھی۔ نرس نے ڈاکٹر کو مریض کے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا اور ڈاکٹر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

نرس نے سوچا تھا کہ علی نواز شاعر مزاج آدمی ہے کھڑکی کے ہر دیکھ کر اور گرد پیٹنے پر اسے غلطے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ علی نواز جب بھی

کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہیں اوپر نہیں بچے فرض پر مبنی تھیں جیسے برآمدے میں بالان میں آنے جانے والے لوگوں کا جائزہ لے رہا ہو اس نے صبح کے وقت بھی اُسے دیکھا تھا اور شام کے لمحوں میں بھی نہ تو طلوع آفتاب سے پہلے جہاں تہاں کھڑے ان ٹنگی اجالوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی اور نہ غروب آفتاب کے بعد بندیوں سے اترتے ہوئے شوق آلود دھندلوں کو وہ پُر شوق نظروں سے دیکھتا تھا۔ تو پھر یہ دیکھتا کیا ہے؟ نرس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا؟

انہی دنوں سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ اور سارے مریض کیموں میں اپنے آپ کو ہر وقت پیٹے رکھتے تھے۔ اس نے علی نواز سے پوچھ ہی لیا تھا۔

”صاف کیجئے۔ آپ کھڑکی سے باہر کیا دیکھتے رہتے ہیں؟“

علی نواز نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں؟“

نرس اس شہر سے جواب پر کیونکر مطمئن ہو سکتی تھی! بولی۔

”آپ نہیں جانتا چاہتے تو میں آپ کو عبور نہیں کر سکتی۔ دیسے سو ہوا آپ کے لئے ٹھیک نہیں بہت کمزور ہو چکے ہیں۔“

اور نرس نے یہ عشوں کر کے کو اس کے اعتماد کو دھکا لگا ہے فرض پر اپنی اپنی ایڑی کی گرگانی سے ٹھک ٹھک کا شور کرتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

اس واقعے کو پورا ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ نرس صبح کے وقت اس کا ٹیبلر کچر نوٹ کرنے کے لئے کمرے میں آئی تو علی نواز نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”نرس! شاید دوسرے رنگ میں ایک ناک صبح دشام آتی جاتی رہتی ہے۔“

”نرس! نرس! نرس نے اسے حیرت ناک انداز میں دیکھتے ہوئے استفادہ کیا۔

”نرس!۔۔۔ وہ جو شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہنتی ہے تو کوری اٹھالے لان میں سے

عزیزتی ہے:

نرس نے علی نواز کو گھوڑ کر دیکھا ماس کی نگاہیں کبدہ پر تھیں۔

”آپ بوڑھے ہو چکے ہیں یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی اس لئے وہ کسی عذر پر ٹھیکھا کر بولی۔
”ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مجھے کیا پتا آپ کس لڑکی کو پوچھ رہے ہیں؟“

علی نواز کو افسوس ہوا کہ اس نے نرس سے یہ سوال کیوں پوچھا ہے۔ نرس اس کے جذبات کیونکر جان سکتی ہے اور اسے کسی مرض سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

شام تک اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ رنگین ساڑھی میں ملبوس لڑکی جب لان میں سے گزرے گی تو وہ خود اس سے گفتگو کرے گا۔ آئندہ نرس سے اس مسئلے میں کچھ نہیں کہے گا چنانچہ شام سے ذرا پہلے جب سورج پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کے پیچھے آہستہ آہستہ اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ وہ لان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ لڑکی آئی۔ اس روز اس نے گلابی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ایک لمبے تھام میں تروتازہ پھولوں کا گلہ دست تھا اور دوسرے میں ٹوکری۔ علی نواز نے اسے دیکھا اور بلا ارادہ اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھ گیا۔ اور اس کے ہونٹ بیٹی کہتے ہوئے غور غور اٹھے۔ لڑکی کے قدم رک گئے اور وہ اسے حیرت ناک نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کا کون سا چارہ ہے بیٹی؟ اس نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے نظریں جھکائیں۔

”میرا شوہر“

”اللہ اسے صحت دے میں دعاگوں گا۔“

لڑکی ایک لمحہ بھی نہ دکی اور دوسرے دنگ کی طرف جانے لگی۔ علی نواز اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

نام ابھی ہوئی نہیں تھی مگر شام کے سائے فضا میں بادلوں کے دواں دواں تانکلوں کی

وجہ سے ہسپتال کے لان میں پھیل گئے تھے۔ علی نواز نے چائے کا پ خالی کر کے چائے کے
 اور پر رکھا تھا۔ اور بے خیالی کے عالم میں دیوار سے لگی ایک بصر کے اوپر کھڑی ہوئی کتابیں
 دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ کسی ایسی کتاب کا انتخاب کرنا چاہتا تھا جسے پڑھتے پڑھتے سو جانے اور
 ساری رات سوتا رہے۔ رات کو گیارہ بائیس بجے تک کتاب کا مطالعہ کرنا اس کا روزمرہ کا
 معمول تھا۔ جس میں خاندان اور ہی فرق پڑتا تھا۔

اس نے اہم تھ بڑھا کر ایک کتاب اشالی یہ برقی بصر کا منتخب کلام تھا۔ تیر کا مطالعہ وہ
 بڑے شوق اور دلچسپی سے کرتا تھا۔ تیر کے اداس کر دینے والے غم سے ایک عجیب و غریب
 ناقابل بیان کیفیت سے دوچار کر دیتے تھے اور وہ کتاب بند کر کے درنگ اسی کیفیت
 میں گم رہتا تھا۔

ابھی اس نے تین چار غم پڑھے ہوں گے کہ اس کے کان میں ایک باریک سی آواز آئی
 "میں اندر آ سکتی ہوں؟"

علی نواز نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا وہی ٹوکی پھولوں کا ایک گلہ ستہ دھنیں اہتھ
 میں لئے دروازے سے کچھ دور کھڑی تھی۔
 "آ جاؤ بیٹی۔"
 لڑکی اندر آ گئی۔

"صبح آپ نے بڑے غلوں سے مجھے بلایا تھا۔ اس لئے۔"

علی نواز نے پھر انہ شفقت سے سمجھ لیا۔

"بیٹی! میں نہیں جانتا تمہارا نام کیا ہے۔ میں تمہارا شکریہ گزار ہوں۔ یہ گلہ ستہ بڑے خوبصورت
 پھولوں کا ہے۔"

"آپ کے لئے ہے۔ میں ان کے لئے ہر روز تازہ پھولوں کا گلہ ستہ لے کر آتی ہوں صبح جو

لانی تھی وہ انہوں نے آپ کے کمرے کے لئے دے دیا ہے؟"

صاف ظاہر تھا کہ ان سے مراد لڑکی کا شوہر تھا۔

”بیٹھو گی نہیں بیٹی؟“

لڑکی نے گلدستہ بیٹھنے کے گلاس میں مٹکا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بیٹی! تمہیں اس بات پر حیرت ہو گی کہ میں نے ہر روز تمہیں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔“

لڑکی بڑے خود سے علی نواز کو دیکھنے لگی۔

”تم بالکل میری اپنی بہو معلوم ہوتی ہو وہ جب چلتی تھی تو بالکل تم جیسی معلوم ہوتی تھی۔“

اس کا تعلق کراچی کے ایک خاندان سے تھا میرے اکلوتے بیٹے نے جب اس سے شادی

کی تو اس نے پہلے دن ہی مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری بہو بھی ہے اور بیٹی بھی بچہ دو

سال بعد وہ جرمنی میں چلے گئے۔ جہاں میرے بیٹے کو بڑی مقبول ملازمت مل گئی تھی۔ سات

سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں دونوں میاں بیوی صرف ایک عرصہ یہاں آئے تھے۔“

علی نواز کے چہرے کے نقش ٹہرے پڑتے گئے اس کی نظر میں فضا میں پھٹنے لگیں۔ لڑکی

نگاہیں جھپکاتے چپ چاپ اس کے الفاظ سن رہی جب وہ ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو

گیا۔ تو لڑکی کرسی سے اٹھ بیٹھی۔

”وہ کب آئیں گے؟“

علی نواز کھڑکی سے باہر ایک اڑتے ہوئے بادل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے الفاظ نہ

سن سکا۔

لڑکی دروازے کی طرف جانے لگی علی نواز بھی آہستہ آہستہ چلتے لگا۔

دونوں دروازے کے باہر نک گئے۔

”بیٹی۔ یہ انسان بھی اللہ کی ایک عجیب مخلوق ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو جاتا

ہے تو کسی نہ کسی ذریعے سے پُر کر لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی کاغذات پر جاتا ہے اور کبھی لاکر

ثابہ تم نے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگایا ہو گا۔“

لڑکی نے اشیات میں سر ہا دیا اور چلنے لگی۔
 ”دیکھو بیٹی! ہو سکتا ہے تم پھر آؤ۔ میں تمہیں کس نام سے بلالوں گا؟
 ”سائرا لڑکی نے کسی قدر سکرا کر کہا۔

جب وہ کمرے سے دروازہ لان میں پہنچی تو اس نے ٹھہر کر ایک لمحے کے لئے مستحقِ ست دیکھا۔ علی نواز ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور جس وقت سائرا نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اندر آ گیا۔ اس نے ایک کونے میں پڑے ہوئے سوٹ کس کو کھولا۔ کپڑوں کے نیچے لمبا تھوڑا لکڑی کا نصف نٹ لمبی اور اسکی قد چوڑی خوشگوار نکال اور کمری پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ نٹوٹن اس کے بیٹے اور بیوی کی تھی۔ بیوی کمری پر بیٹھی تھی اور اس کا بیٹا کمری کے پیچھے اپنی بیوی کے دونوں کندھوں کے اوپر دونوں لمبا تھوڑا رکھے کھڑا سکرا رہا تھا۔

اس روز کے بعد سائرا کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دوسرے تیسرے دن وہ لان میں سے گزرتے ہوئے علی نواز کے دروازے پر حضور آتی تھی۔ اور اس کی خیریت دریافت کر کے چلی جاتی تھی وہ زیادہ سے زیادہ دو منٹ وہاں ٹھہرتی تھی مگر اس بہت کم وقت میں بھی تب دق کے بوزھ مرض کے اندر زندہ رہنے کی خواہش میں اضافہ کر دیتی تھی۔ ابھی تک علی نواز نے اس کے شہر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملنے کی آرزو کا اظہار کرتا سائرا کہہ دیتی۔
 ”انکل! وہ خود آپ سے ملنے کے لئے بلے تاب ہیں۔“

”تو میں تمہارے ساتھ چلنا ہوں“ علی نواز کہتا۔

نہیں انکل! اکثر نے آپ کو مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ یوسف پر کوئی ایسی خاص پابندی نہیں۔ وہ خود آئیں گے۔ وہ مجھ سے یہ بات کہہ بھی چکے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو سائرا یوسف کے ساتھ آگئی۔

یوسف نے پھل سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر کھینچی اور سائرا کے لمبا تھوڑے اور شاداب پھولوں کا گلہ رسہ تھا۔ ان دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر علی نواز کی آنکھوں میں ایک

ایسی چمک آگئی جو اس کی دلی مسرت کا پتہ دے دی تھی۔

یوسف کا لبہ دلچسپ ہر اثناء تھا۔ طویل بیماری کی وجہ سے اس کے رخسار چمک گئے تھے اور آنکھوں کے اوگرد گڑھے بڑھ گئے تھے چہرے پر کہیں بھی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی تاہم جب اس نے علی نواز سے مصافحہ کیا تو علی نواز کو محسوس ہوا کہ وہ کافی توانا ہے مگر ہوشی نے اس کی انگلیوں کی گرفت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ انداز کی بھری کچھ دیر علی نواز سے باتیں کرتے رہے اور جب رخصت ہونے لگے۔ تو علی نواز نے ایک ایسے لمحے میں جو نظر ایک باپ ہی کا ہو سکتا ہے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یوسف! میں محسوس کر رہا ہوں جیسے یہاں اپنا بیٹا جو سات برس سے جہنمی میں ہے۔ اپنی بھری کے ساتھ واپس آ گیا ہے میری اداسیاں دور ہو گئی ہیں۔ اور مجھے زندگی کی سچی خوشی مل گئی ہے۔“

یوسف نے ہلچکا۔

”انکل! کیا آپ کے بیٹے کو آپ کی عداوت کا علم نہیں ہے؟“
علی نواز نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔

”نہیں میں نے اسے نہیں بتایا۔ اسے مجھ سے بے حد محبت ہے۔ بیماری کا ذکر کروں گا تو وہ مضطرب ہو کر واپس آ جائے گا۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد اسے بڑا اچھا پانس ملا ہے۔ یہ پانس حنائی نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر کوئی بات نہیں میری آکس پوزن ہو گئی ہے۔ میری زندگی کا خطا پڑ ہو گیا ہے۔“

”مگر انکل! اپنا خون اپنا خون ہوتا ہے۔ میں وہ نہیں بن سکتا جو آپ کے لئے آپ کا بیٹا ہے تاہم مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھئے۔“

یوسف کی زبان سے یہ الفاظ سن کر علی نواز کی آنکھوں میں وقتی طور پر بالور کی کابو سا یہ سا ہراساں مقلاس کی بجائے چمک دکھ آگئی۔

اب یہ ہوا کہ سائرہ تو اس کے ہاں سمول کے مطابق آتی ہی رہی تھی۔ یوسف بھی پہنچے ہیں ایک مرتبہ آنے لگا۔ ایسا ہوتا رہا۔ تقریباً ایک ماہ تک اس کے بعد گئی روز کے بعد سائرہ آئی۔ علی نواز نے اسے دیکھا تو نہ جلنے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ دیر سے دہاں کھڑی ہے۔ کیوں سائرہ بیٹی اکب آئیں؟

”ابھی آئی ہوں۔ آپ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔ اور میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ گھر چلے گئے ہیں۔“

”یوسف گھر چلا گیا ہے۔ الحمد للہ۔“

علی نواز کچھ اور کہنے والا تھا کہ سائرہ کہنے لگی۔

”اس رات ایک بڑا SERIOUS کیس آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ یوسف! تباہی حالت تو۔ ٹھیک ہے۔ گھر جاسکتے ہو۔ اور یوسف نے فون کر کے گھر سے گاڑی منگوا لی اور ہم چلے گئے۔ انکل! یہ۔ انکل! آپ یہ نہ سوچیں کہ لے بیٹا چلا گیا۔ بات یہی کچھ۔ ایسی۔ ہو گئی تھی۔ اس نے ڈک ڈک کر فقرہ مکمل کیا۔ علی نواز نے سوچا وہ شرمناک کی وجہ سے ڈک ڈک کر بات کر رہی ہے۔“

”نہیں بیٹی! ہرگز نہیں۔ میری حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسی پہنچے تھے چلنے پھرنے کی اجازت دے دیں گے۔ میں گھر جا کر تم دونوں کو اپنے ہاں بلاؤں گا۔ کم از کم ایک مہینہ تک تم وہیں رہو گے۔ کیوں بیٹی؟“

سائرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دیکھو بیٹی! میرے بیٹے کو صحت دہائی پر میری طرف سے ہزاروں مبارکبادیں دینا۔ اللہ تم دونوں کو سدا سکھی رکھے۔“

سائرہ سر جھکانے کمرے کے باہر چلی گئی۔ علی نواز نے دیکھا کہ وہ اسی طرح سر جھکانے چلی

جا رہی ہے۔

وہ ہر روز آتی تھی اور آکر بتاتی تھی۔ آج یوسف نے لمبی سیر کی ہے۔ آج اس نے پیٹ بھر کر اپنی من پسند چیزیں کھانی ہیں۔ اور صرعل نواز کی صحت میں بڑی نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اس کی صحت کافی حد تک عود کر آئی تھی۔ ڈاکٹر خدیوہ ان تھا کہ اس کی حالت میں ایسی خوشگوار تبدیلی کیسے آگئی ہے !

دوسرا آدھا مہینہ گزر گیا تھا۔ کمرستانی علاقوں میں برہمن ہرف بادی کے لئے مخصوص ہے ہسپتال کے لان میں آدھ رات خامی کم ہو گئی تھی۔ دو ہفتوں کے بعد ہرف گرنی رک گئی تھی۔ فضا میں سفیدیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سفیدیوں میں سورج کی کرنیں مرنے کے تاروں کی طرح بکھر گئی تھیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور علی نواز کی حالت پہلے کی نسبت خامی بہتر ہو گئی تھی۔ اسے ہسپتال سے جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ مگر وہ حیران تھا کہ پچھلے پانچ روز سے سارا دن کیوں نہیں آئی۔

اور چھ دنوں کے بعد سارا دن آگئی۔

اس کے چہرے پر ایک گہری اندرونی کشش کی کیفیت طاری تھی۔ وہ اند آئی اور دیوار کے قریب چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ علی نواز اسے دیکھ نہ سکا اور جب دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ سارا دن اسے وہاں کھڑی تھی۔

”میں آج آپ سے کچھ کہنے کے لئے آئی ہوں۔ اس نے بڑے دھیمے دھیمے میں کہا۔

علی نواز اس کے قریب ہو گیا۔

”کہو بیٹی ؟“

انکل ! آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں نے پچھلے کئی دن اور کئی راتیں کس اضطراب اور کرب میں کاٹی ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

”مگر کیوں بیٹی؟“

”میں۔۔۔ انگل! میں نے آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ۔۔۔
یوسف۔۔۔ ہسپتال میں۔۔۔ ان کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ ہم انہیں گھر لے گئے۔
۔۔۔ اور تین دن کے بعد وہ چل بسے۔۔۔ انگل میں آپ کو بتانہ سکی۔ میں نے سوچا آپ
کو بڑا اشتیاق ہو گا۔ آپ کی محنت کو بڑا دھچکا لگے گا۔ آپ۔۔۔ اودہ انگل! میں نے
جھوٹ بولا۔ میں نے فریب۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے کچھ دینا چاہیئے تھا
۔۔۔ پر۔۔۔ انگل! میری زبان ڈکی رہی۔ مجھے معاف کر دیجئے انگل۔۔۔ معاف کر دیجئے۔“
سانرہ نرا درو قطار رونے لگی۔ اس کا بدن بڑی طرح کانپ رہا تھا۔
علی نواز آنکھیں جھپکاتے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

”مہ نہیں بیٹی! تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ کوئی دھوکا نہیں دیا۔ کیونکہ تمہاری
نیت نیک تھی۔ تمہارے اندر میرے لئے ہمدردی اور محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔
وہ نہیں بیٹی! زندگی میں تو ہر غلام کسی نہ کسی طرح پڑ ہو جاتا ہے سانرہ بیٹی! میں آج نہیں بتا
ہوں۔ میں نے تمہیں صرف یہی بتایا تھا کہ میرا بیٹا اور پوسٹ سال سے جرنی میں ہیں۔“
سانرہ نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”بیٹی! دو سال ہوئے وہ ایک کار کے حادثے میں مر گئے تھے۔“
”انگل!“

”وہ مر گئے تھے بیٹی۔“

اب سانرہ کے چہرے کا کرب ختم ہو گیا تھا اس کی جگہ ایک فری اور ملاحت آ گئی تھی۔
علی نواز نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔

بندگلی، بڑا مسئلہ

اس گلی کا شمار لاہور کی اُن پانچ چھ گلیوں میں ہوتا تھا جو بڑی لمبی تھیں مگر اُس گلی کو تو یہ امتیازی شان بھی حاصل تھی کہ جب بازار سے اس کے اندر داخل ہوتے تھے تو دونوں طرف کھڑے ہوئے مکانوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا تھا، مگر پھر جدید گلی تنگ ہوئی چلی جلتی تھی اور آخر میں تو اس قدر تنگ ہو جاتی تھی کہ دو آدمی بھی پہلو پہ پہلو چل کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ۴۷ء سے پہلے اس گلی کی بیشتر آبادی غیر مسلم خاندانوں پر مشتمل تھی اور جو چند ایک مسلم گھرانے آباد تھے تو یہ وہ لوگ تھے جو سبزیوں اور چل بیچتے تھے یا سرچی، موہار اور جھنی تھے، ان کی مکانیں گلی کے اندر ہی مکمل رہتیں اور آبادی کی اکثریت کے لئے ان کی حضرات میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

پاکستان قائم ہوا تو غیر مسلم آبادی اپنے مکانوں کو چھوڑ کر بھارت میں منتقل ہو گئی اور اس کی جگہ اس گلی کے خالی مکانوں میں مسلمان مہاجرین نے رہائش اختیار کر لی۔ اس مدت میں گلی کے اندر جو مسلمان رہتے تھے ان میں سے سوائے ایک بوڑھے بڑھئی اور دین کے سب کے سب موقع سے غائب ہو گئے اور دوسرے غلوں کے اچھے اچھے خالی مکانوں میں چلے گئے۔ اور دین ایسا نہ کر سکا ایک تو اس درجے کا اے یہاں رہتے ہوئے کم و بیش نصف صدی گزر گئی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ نہ تھا تھا، تنہا آدمی کو لاپٹے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

قیام پاکستان کے بعد اس گلی میں کوئی بڑا مکان اگر اس کی جگہ یا مکان نہ بنایا گیا، البتہ مسلم آبادی نے گلی کی ایک ایسی عمارت کو جس میں بیٹے رہنے والوں نے ایک ویڈیو گیم روم قائم کر رکھا تھا

اسے عزادی کریم کے بعد مسجد بنا دیا۔ ریڈنگ روم کا مسجد میں جانا الدین کے لئے مفید ثابت ہوا اور وہ اس طرح کو بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنا حصہ نہیں کر سکا تھا مگر تاہم ناقص ہوتا۔
 محلے کی مسجد کئی نے اسے بیس روپے الاؤ تخواہ پر مسجد کی صفائی کے لئے ملازم رکھ لیا اور یوں اسے زندگی کی بنیادی ضرورتیں پیا کرنے کا ایک وسیلہ مل گیا جس پر وہ ہر طرح مطمئن تھا۔

گلی کے دو سب سے اونچے مکان گلی کے ان دو گھروں میں واقع تھے جن کے آگے کئی عمارت کا فاصلہ چھوڑ کر سڑک پہلی گئی تھی۔ ان دونوں مکانوں میں تاجر پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ایک مکان میں ادھیانے کا ایک خاندان آباد ہو گیا تھا جس کے سربراہ علی احمد انصاری تھے۔ اس کے بالمقابل جو مکان کھڑا تھا۔ اس میں دلی کا کوئی تاجر آباد تھا۔

انصاری صاحب خاصے اُسودہ مال تاجر تھے۔ تارم آدمی ہم جو تھے صدیقی طور پر ان کی نظر خوب سے خوب تر بردہتی تھی۔ انہوں نے پہلے سعودی عرب میں جانے کی کوشش کی اس میں کامیابی نہ ہوئی تو قطر میں پہلے گئے وہاں ان کا کام دہار روز بروز وسیع ہوتا گیا تو انہوں نے آہستہ آہستہ بیوی بچوں کو بھی وہیں منتقل کیا اور مکان پر تالا لگا دیا کہ جب کبھی حالات نے واپس آنے پر مجبور کر دیا تو اس کو اپنا مکان بنا لیں گے۔

انصاری صاحب جب قطر پہنچے تو ان کو غالباً یہ توقع تھی کہ وہ تین چار سال کی مدت میں خوب دولت کما کر واپس آجائیں گے، لیکن وہ وہاں سے سعودی عرب چاہیے اور وہاں سے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ وسیع اہل دیال لندن پہنچ گئے ہیں ان کا جو خط ان کے تاجر دوست خان صاحب اکبر خان کے پاس پہنچتا، اس میں وہ یہی بتاتے کہ میں دو ایک سال کی بات ہے وہ وہاں اپنے پرانے گھر میں آجائیں گے، لیکن چند سال بعد ہی گئے اور ان کے آنے کا کوئی سال اور ہینہ مقرر نہ ہو سکا۔

باتوں میں شروع ہوا تو لاہور میں بے پناہ بارش ہوئی اگر انصاری صاحب مکان کے اندر موجود ہوتے تو انہیں علم ہو جاتا کہ ان کے مکان کی بالائی منزل کی دیواروں پر جا بجا

خوافیں بڑھ گئی ہیں۔ فرخ پرچہ میں سے پانی پلک پلک کر جمع ہو تا جا رہا ہے اور ایک دن جب بارش اپنے بارے عروج پر تھی، اس گلی کی خفایاں ایک ایسا دھماکا ہوا کہ سب کے دل دھل گئے ہر شخص کو یوں غسوں ہوا جیسے اس کے ہسائے میں کوئی مکان گر پڑا ہے خوف و ہشت کے عالم میں زبانی لنگ سی ہو گئیں۔ بجلی تو سرشام ہی جا چکی تھی۔ جیسے اندھیرے میں اہل حقیقت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ پھر کچھ فوجوان ہاتھوں میں مادچے لے کر اپنے اپنے گھروں سے باہر آ گئے۔ معلوم ہوا انصاری صاحب کا مکان گر گیا ہے۔

آہستہ آہستہ لوگوں کے اوسان بحال ہونے لگے قریب ہی اتنا بڑا حادثہ ہو جائے تو لوگ سو کیو کر سکتے ہیں۔ بہر تین چار گھروں کے مرد اور عورتیں اکٹھے ہو کر یا الگ الگ ٹولوں میں اس واقعے پر اظہار خیال کرنے لگے۔

مکان گر پڑا تھا، مگر اطمینان کی صورت یہ تھی کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ جو دیواریں زمین بوس ہو گئی تھیں وہ گذشتہ سات برس سے اس خاندان کے افراد کی صحبت سے عروم ہو چکی تھیں جو ان کے درمیان رہتے تھے۔

صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے کہ بارش ختم گئی — لیکن ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی اور مارچوں کی دھم دھن میں صورت حال کا صحیح جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔ گلی کی مسجد میں نوؤن نے اذان دی تو لوگ مسجد کی طرف رخ کرنے سے پہلے جانے حادثہ کی طرف جانے لگے۔ وہاں اور تو کچھ نہیں ہوا تھا، اینٹوں اور بے کے ڈھیر سے وہ راستہ سدھ رہا گیا تھا جو بازار کی سڑک سے جالما تھا اور اس ڈھیر کو ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

پہلے دن جانے حادثہ پر لوگوں کا اتنا بندھا رہا کہ حرف گلی ہی کے نہیں ان علوں سے بھی لوگ آتے جاتے رہے جنہیں انصاری صاحب کے مکان کے گرے کی خبر ملی تھی۔ انہوں نے اس سے پیشتر بھی گرے ہوئے مکان دیکھے ہوں گے، مگر اتنی نظرت میں جو ایک غیر معمولی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش بھیجی رہتی ہے وہ انہیں وہاں جوں جوں آئے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جب

ادھر ادھر بکھری ہوئی اینٹوں کے علاوہ اپنے سامنے چست کی گرمی پرئی خستہریوں، ٹوٹے بھوٹے
فرخچہ اور گھروا استعمال کے برتنوں کو دیکھتے تھے تو نہ جانے اس منظر پر انہیں کیا کشش محسوس ہوتی
تھی کہ وہاں سے نظریں ہٹانا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔

گلی کے سارے لوگ وہاں آکر واپس جا چکے تھے اور جو نہیں آئے تھے وہ کسی خاص مجبوری کی
وجہ سے گھروں سے باہر نہیں نکلے تھے، البتہ ایک شخص روتا تھا جہہ تو وہاں پہنچا اور نہ وہاں رہا۔ پہنچا
چاہتا تھا، کیونکہ اس کے روزمرہ کے معمولات میں کبھی کسی قسم کی بےقاعدگی نہیں ہوتی تھی اور
اس روز بھی وہ کسی بےقاعدگی کو پسند نہ کر سکا وہ رات کی روٹی تو بے پروگرام کر کے اور اسے
چائے کے ساتھ کھا کر مسجد میں آگیا تھا اور معمول کے مطابق اس کی صفائی میں مصروف ہو چکا تھا
شریف حلوانی کا بیٹا عنایت جب مسجد کے سٹاؤنٹ میں نہانے کے لئے آیا اور اس نے الدین
کو بدستور مسجد کے فرش پر گیلیا کپڑا بھیرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا،

”چاچا! پتا ہے رات انصاری صاحب کا مکان مگر پڑا تھا؟“

الدین نے اس کے جواب میں سر ہلایا۔

”دیکھا چاچا؟“

نہیں یہ کوئی تماشا ہے؟“

لڑکے نے اور کچھ نہ پوچھا اور سٹاؤنٹ میں چلا گیا۔

انصاری صاحب کا مکان کیا گرا تھا تب ایسے منظر پیدا ہو گئے تھے جن کا شوق گلی کی اجتماعی
فندگی سے ہونا ایک فطری امر تھا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ انصاری صاحب کو اس حادثے کی اطلاع
کیونکر دی جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ جب تک وہ یہاں نہیں آتے ان کے سامان کا کیا کیا جائے۔
بہت سا سامان تو بے کسمپختی دب گیا تھا، مگر کچھ فرخچہ اور برتن نکالے جاسکتے تھے۔ انہیں کہاں
اور کیسے رکھا جائے اور تعمیر مسئلہ تھا گلی کے اس حصے سے سلب ہٹانا، کیونکہ سلب ہٹانے میں گلی دھواں
کا بیرونی دھبے سے کوئی رابطہ سہولت کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ زمین کا وہ حصہ جو گلی کو بیرونی

سڑک سے ملتا تھا وہ تمام کام کا تمام سب سے ڈھک چکا تھا اور سب کے اوپر سے گزرتا تھا
دو شمار کام تھا۔

اسی شام کو مسجد کعبہ جے گلی کے ایک دفتری ادارے کی حیثیت حاصل تھی، کے صدر خان
صاحب اکبر خان کے مکان میں گلی کے اہل الرائے افراد کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ طے کیا
گیا کہ سب کو بٹانا بہت ضروری ہے اس کی اطلاع خودی طور پر کارپوریشن کو دینی چاہیے۔
انصاری صاحب کو فوراً خط لکھ دینا چاہیے کہ ان کا مکان گر پڑا ہے، اگر اپنا سامان لے جائیں
خط لکھنے کی ذمہ داری خان صاحب نے برضا و رغبت قبول کر لی۔ کارپوریشن کو اطلاع دینے
کا فریضہ کئی کے سیکرٹری ذریعہ ٹھیکیدار کے حوالے کر دیا گیا۔

تین روز بیت گئے، مگر کارپوریشن کا علاحدہ حرکت میں نہ آ سکا، تو گلی کے لوگوں نے کئی کے
صدر خان صاحب سے شکایت کی کہ ہماری وقت دور نہیں ہوئی، جس باہر نکلتے کے لئے گلی
کے دوسرے سرے پر جانا پڑتا ہے اور یہ کافی دور ہے خان صاحب نے سیکرٹری کو بلا کر پوچھا
ٹھیکیدار صاحب! آپ نے کارپوریشن سے رابطہ قائم نہیں کیا؟

ٹھیکیدار صاحب نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دوتے کی "صاحت یوں کی،

خان صاحب! کارپوریشن کو اطلاع دینا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایک آدمہ لکھنے
میں یہ کام کیا جاسکتا ہے، مگر میں سوچتا ہوں انصاری صاحب کا سامان سب کے بچے پڑا
ہے۔ اس سامان کے ساتھ گڑ بڑ کا اندیشہ ہے، کل انصاری صاحب لے آکر پوچھا خان صاحب!
کیا آپ میرے سامان کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ تو اس وقت جواب دینا مشکل ہو جانے لگا، بہتر
یہ ہے کہ براہ راست انصاری صاحب سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اس طرح کل ہم پر کوئی اعتراض
نہیں ہو گا۔

بات معقول تھی، کئی کے ارکان کی سمجھ میں آگئی، سب نے رائے دی،

"خان صاحب! آپ انصاری صاحب کو تار و سے دیں یا ان کا ٹیلیفون نمبر دریافت کر کے

ترنگ کر دیں، ٹھیکیدار صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں یہ ہزام اپنے سر نہیں بن چاہیے۔ تیسرے روز کبھی کی میٹنگ ہوئی تو خان صاحب نے بتایا، میں نے ٹیلی گرام بھیج دیا ہے۔ انصاری صاحب ٹیلی گرام ملنے ہی یہاں آجائیں گے۔

گلی والوں کی وقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی بیمار ہوتا تو گلی کے اندر سواری کا بندوبست کرنا ناممکن تھا۔ بیمار کو بڑی مشکل سے دوسرے راتے سے باہر لے جایا جاتا تھا اور وہاں جا کر تلگے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

گلی والے صبر و تحمل کے ساتھ یہ وقت برداشت کر رہے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ انصاری صاحب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فوراً آجائیں گے اور راستہ صاف کرادیں گے۔ چار دن گزر گئے۔ فضا میں اضطراب اور بے چینی کے آثار عموماً کے جانے لگے۔ گلی کا ایک شخص دوسرے سے کہتا۔

چار دن گزر گئے ہیں، تار تو ایک دن میں پہنچ جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر ایک دن کا تو سبھی ڈر پڑھ دن کا یہی اب تک تو انصاری کو آ جانا چاہیے تھا۔

مخاطب جواب دیتا،

”عزور پہنچ جانا چاہیے تھا، وہ کیوں نہیں آیا؟“

خان صاحب جب بھی کسی غرض سے کہیں آتے جاتے تو ان سے سلام کے بعد یہی سوال کیا جاتا،

”خان صاحب جی! انصاری صاحب آجائیں گے ناں؟“

خان صاحب ایک ہی جواب دیتے،

”آئے گا، کیوں نہیں آئے گا؟ ان کے بچے میں دبا دبا غصہ ہوتا۔“

ایک صبح گلی کے لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے ایک نئی خبر سونگھی، خبر یہ تھی کہ راتوں رات

کسی نے انصاری صاحب کا سامان نکال لیا ہے۔ واقعی وہ شکستہ فریجر اور تانبے دھیرہ کے برتن

جھپٹے میں دھنسنے ہوئے ہر روز نظر آیا کرتے تھے اب غائب تھے۔ بچے کے ارد گرد پھر
تاشا بنوں کا جھرم ہونے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے۔

”یہ سامان کون لے گیا؟“

یہ سوال سننے والا اپنی حیرت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا۔

اس روز شریف اور بنا رگھر مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ
نور محمد ٹھیکیدار چاچا الدین سے ہوئے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور الدین نے اپنے دائیں ہاتھ
کی انگلی آسمان کی طرف اشارہ کی ہے۔ شریف اور بنا کسی نئی خبر کی امید میں دیریں دیر تک
تھکے۔ بنا بولا۔

”ٹھیکیدار صاحب کوئی منتر پتا چلا؟“

ٹھیکیدار نے جواب دیا۔

”میں نے چاچے سے پوچھا ہے تم راتوں کو بہت کم سوتے ہو، گلی کی چوکی دہری کرتے رہتے
ہو۔ مصلح ہو گا نہیں یہ بد زانی کس نے کی ہے؟“

ضرور پتا ہو گا جی کیوں چاچا؟

الدین نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ اس کی انگلی بدستود آسمان کی طرف
اٹھی ہوئی تھی۔

اتنے میں عنایت بھی آگیا۔ وہ معنی خیز انداز میں اپنا سر ملادہ تھا اور اس کی آنکھیں کسی خاص
اکتشاف پر چمک رہی تھیں سارے گلی والے عنایت کو گپ باز سمجھتے تھے۔ اس کی بات پر
بہت کم اکتفا کیا جاتا تھا اور شریف نے اس ٹڈ سے کہیں اس کا بٹا کوئی سنسنی خیز خبر سن کر
خواہ مخواہ فتنہ نہ اٹھاوے۔ اس کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پشرا! باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے سنا تم نے؟

مگر عنایت نے جھٹ کہہ دیا۔

”انصاری صاحب کا سامان پتا نہیں کون لے گیا۔ پریمیاں جی:

عنایت اپنے باپ کو یہاں بھی لٹکا تھا۔ اس کے منہ سے پرکا لفظ نکل کر بتا رہا۔
”ہترا! بتانا کیا معاملہ والہ ہے؟“

اب کے عنایت بتا سے مخاطب تھا،

”نصف تو قلعی گڑ جو ہر سارے برتن کس کے قلعی کر رہا ہے؟“

اس کے باپ اور بیٹے نے اپنی نظریں عنایت کے چہرے پر جمادیں۔ چاروں نظریں بڑی
بے تابی سے پوچھ رہی تھیں،

”کس کے برتن؟“

عنایت کی دھڑکی ڈھیل پڑ گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی کمر پر کس کر باندھا اور ایک طرف
جاتے ہوئے کہنے لگا،

خان صاحب کے۔ ان کے مکان کے پچھواڑے دیکھو جا کر:

شریف نے فوراً سے نفو کا اور بیٹے سے کہا،

”چپ بیٹے بے شراں۔“

عنایت لے جاتے جاتے قہقہہ لگایا اور ایک لمبی نہ ٹھہرا۔ عجیب بات تھی الدین کی
انگل اب بھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار صاحب کہہ رہے تھے، دیکھ لیا شریف تیرا
بیٹا جیل میں جائے گا۔

گلی والے خان صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کئی گھروں میں تو ان کے گھر سے دودھ
جمع لے کر بھرے ہوئے ڈول جاتے تھے۔ علاوہ ان کے وہ مسجد کی موت کے کام میں سرگرمی سے
حصہ لیتے رہتے تھے۔ ۲۰ روپے بھر پھیلنا شروع ہو گئی۔

بیٹے نے ابراہیم دودھی سے سرگوشی کی۔ ابراہیم نے عبدالکریم کو پکارا بیٹے والے کے کان میں کہہ
دی عبدالکریم نے جہاں سٹھانی فروش تک پہنچا دی۔ اور ہر ایک جب یہ خبر دوسرے پر اعتماد کرتے

ہوئے بتا تھا تو ساتھ تاکیداً یہ بھی کہہ دیتا، یاد! میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں، کسی اور کو ہرگز نہ بتاتا۔ اور رازداری کا یہ معاملہ اس طرح چلا کہ خان صاحب کے کانوں میں بھی اس کی ہلک بڑھکی، جس شخص نے ان کو یہ بات بتائی تھی، اس کو قوتی تھی کہ وہ اس کے انفاظ سننے ہی بھڑک اٹھیں گے اور عنایت کر بے عزت کر کے رکھ دیں گے۔ مگر انہوں نے دو تین لمحوں کے لئے گھون بھٹکا کر کچھ سرچا اور چپ چاپ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے، خبر نہانے والے کی نظر اس وقت تک ان کا تعاقب کرتی رہی جب تک وہ گھر کے اندر نہ چلے گئے، نام سے پہلے پہلے خان صاحب کے رد عمل کا بھی سرا یک کر علم ہو گیا، ٹھیکیدار نور محمد کو اس کا علم ہوا تو وہ درودھ کا خلل گلاس اپنی نوکرانی کو دیتے ہوئے ابراہیم سے کہنے لگا:

”ابراہیم! پتلی میں پانی اُبل رہا ہے، ٹھکانا گر پڑے گا۔ میں نے کہا جس تھا عنایت جیل چلے گا!“

”اچھا ٹھیکیدار جی!“

”دیکھ لینا، ہوتا کیسا ہے ابراہیم! کسی پر الزام لگاتا آگ سے کھینچا ہے، ضرور کچھ ہوگا۔“

اور اسی وقت بتے نے آکر بتایا،

”ٹھیکیدار جی! مسجد میں میٹنگ ہو رہی ہے، خان صاحب نے آپ کو بلایا ہے جلدی چلئے۔“

ٹھیکیدار نے ابراہیم کو اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، دیکھ لو میں نہ کہتا تھا ضرور کچھ ہوگا۔

ابراہیم نے سر ہلکا کر اس کی تائید کر دی۔

مسجد میں اتنے لوگ جمع ہو چکے تھے کہ صحن بھر گیا تھا، خان صاحب دیرار کے ساتھ بیٹھ

نکلے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے شریف کھڑا تھا جس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار پہنچا، تو ایک دم کئی آوازیں بلند ہو گئیں۔

”آئے ٹھیکیدار صاحب۔“

کئی لوگوں نے ان کے لئے اپنی جگہ خالی کر دی اور خر و کھڑے ہو گئے، خان صاحب نے

انہیں اپنے قریب بلایا اور جو لوگ اٹھ بیٹھے تھے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

لوگ آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔ لگتا تھا ہر ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہا ہے۔ اتنے میں خان صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ سوا میں بھرا یا اور کہنے لگے: بھائیو! کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟ سب آوازیں گرج اٹھیں: جی ہاں:

خان صاحب نے غصہ اپنے حلق سے نیچے اتاری اور اپنے دائیں ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے بوسے، میں نے نو دس برس آپ سب کی خدمت کی ہے اب سب نے مسجد کئی کا مجھے صدر چنا تھا، چنا تھا، یا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ چنا تھا، چنا تھا، ... آوازوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

خان صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا،
کبھی آپ نے مجھے بددینا ہی کر کے بوسے پایا ہے؟
نہیں نہیں:

”مگر آج مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے انصاری کے گھر سے برتن چرائے ہیں۔ اور اگر اللہ سے ڈرو، اللہ کی لاشی ہے آواز بولتی ہے۔“ یار رکھو۔“

شریف اور ایک قدم اٹھا کر خان صاحب کے قریب چلا گیا۔

خان صاحب جی! — میں سناٹی مانگتا ہوں، ہاتھ جوڑتا ہوں، اور وہ ہاتھ جوڑ کر گواہ بنائے گا۔

”سناٹی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خان صاحب سے پوچھتا ہوں ان کے مکان کے بھروسے ختمو نقلی گروہوں سے کس کے برتن قلمی کر رہا ہے اور ابھی برتن ختم نہیں ہونے یہ سینکڑوں برتن آخر کہاں سے آئے ہیں؟“

سب کی نظر میں عنایت کی طرف اٹھ گئیں وہ اس جگہ کھڑا تھا جہاں نمازی جوتے رکھتے ہیں۔
”چپ اور حرامزادے! شریف گرجا۔“

عنایت نے باپ کے فضلے کا کوئی خیال نہ کیا۔ کہنے لگا،

انصاری صاحب کے مکان کے بلے میں جو برتن نظر آتے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔
کیا خان صاحب بتائیں گے کہ بٹھے کی رات کو ان کی ایک نوکرانی اور دو نوکرہ دھوا دھڑ بھرتن
نکال کر جنیں لے گئے تھے؟ عنایت نے اپنا حق کھل کر کے چھوڑا اگرچہ اس کا باپ ہمیشہ کہتے
چنب کر بکتارہ۔

خان صاحب اس کتے کو جواب دیں: بٹھے نے کہا۔

ہرگز نہیں۔ خان صاحب ایک آوارہ گرد، غریبے وار جھوٹے منکار لونڈے کو جواب
ہرگز نہیں دیں گے۔ ٹھیکیدار صاحب نے اٹھ کر پر جوش بچھے میں کہا۔
خان صاحب کو جواب دیں: ابراہیم نے کہا۔

خمس۔ بالکل نہیں۔ جواب دینا خان صاحب کی توہین ہے؟ ٹھیکیدار خان صاحب کا
پوری طرح ذہان کو دلم تھا۔ ادھر خان صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑے سکون کے ساتھ بیٹھے
تھے اور تختیں آبرم نظروں سے ٹھیکیدار کو دیکھ رہے تھے۔

عنایت بولا:

خان صاحب جہاں ابھی بلے کے بچے اور برتن اور قیمتی سامان بھی ہے۔ یہ کہہ کر وہ تیزی
نثر اور جانے لگا۔ ٹھیکیدار پکڑوا اس بد معاش کو بکتارہ گیا۔

سینگ ختم ہو گئی، لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔
اس سینگ کے ایک روز بعد۔

مسجد کے محن میں شریف، ابراہیم اور خٹو بیٹھے تھے، شریف اور ابراہیم مسجد سے ہمارے پاس
جا رہے تھے کہ خٹو نظر آیا جو حان صاحب کے مکان سے کچھ فاصلے پر چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے
اسے روکا اور امراہ کے مسجد میں لے آئے۔ وہ اس سے بار بار انصاری کے برتنوں کے بارے میں
دروازہ کر رہے تھے اور وہ تھا کہ صرف ایک ہی فقرہ رٹے جا رہا تھا۔

”برقن خان صاحب نے دیئے تھے۔ میں اللہ جانے کس کے :

اس سے زیادہ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور ابراہیم جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب جرتے ہیں رہا حنا کہنے لگا۔

محنت مجوری کر کے بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں مجھے نہ گھسیٹو اس لئے میں ہاں کہہ دیا ہے : وہ یہ الفاظ کہہ کر چلا گیا۔ شریف اور ابراہیم ایک دوسرے کا منہ جھکتے رہ گئے۔

شریف تو بچے کا گوندواتوں تلے دلہنے لگا اور ابراہیم نے بغیر کسی مقصد کے صاحبان دانی سے صاحبان نکالا اور اسے ناک کے پاس لے جا کر سو بگھنے لگا۔ ان سے کچھ دور مسجد کے صحن کے کنارے اور دین ایک ٹوٹی ہوئی ڈبل اینٹ سے اس بکس کے کیل درست کر رہا تھا جس میں غازی جوتے رکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کے لئے جلتے تھے۔ انہماک کے عالم میں اس کے منہ سے حقوق بہہ کر داڑھی کے گرد آلود ہاں میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں بکس پر جمی تھیں اور گلتا تھا کہ اسے شریف اور ابراہیم کی موجودگی کا کوئی علم نہیں ہے۔

عنایت اٹھ میں پتیل کا ایک ڈول لٹکانے اندر آیا اور ایک ٹوٹی کھول کر اسے پانی سے بھرے لگا۔ شریف کی اس پر نظر پڑ گئی۔ فحش سے بولا۔

”اوبے خراں۔ بے حیا دا۔“

عنایت نے ٹوٹی بند کردی اور باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”میں بے شرم کیوں ہوں ؟“

”کر کیا رہا ہے ؟ باپ نے پوچھا۔

”کر کیا رہا ہوں، تیار لے گا کون کوئی بنا کر دیتی ہے، بولا بار ڈول میں درپانی تولے آ۔“

اس میں بے شرمی کیا ہے میاں جی ؟

اس سے بیشتر کہ شریف اپنے بیٹے سے مزید کچھ کہے ابراہیم نے کہا۔

چننا یہ بے شرمی کا کام نہیں ہے جوتوں نے کل کیا تھا۔ توبہ۔ توبہ خان صاحب پر اتنا بڑا

الحام الفد سے ڈرو پڑنا

غایت نے ڈول ایک طرف رکھ دیا۔

”میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”میں کہتا ہوں بک بک بد کردہ شریف کا ہاتھ لے اختیہ رپاڑوں کی طرف گیا، مگر جتنے قورہ صحن سے باہر اتار آیا تھا۔“

”میاں جی! اگر خان صاحب کہہ دیں کہ میں جھوٹا ہوں، یوں نہیں سر پر قرآن اٹھا کر۔
قرعے سات چوروں کی سرلوں، آف نہیں کروں گا۔“

شریف کا جھرو غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کو خوشنما نظروں سے دیکھنے لگا۔
غایت نے ڈول ایک ہاتھ میں اٹھالیا۔

”نباں جی! کل جوا نصابی آئے گا تو گلی کے لوگ اسے کیا منہ دکھائیں گے، پوچھے گا بارو!
میرے برتنوں اور چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے، منہ دکھا سکے گا؟“

غایت چلا گیا، نصابی ایک سناٹا چھا گیا۔ شریف اور ابراہیم کی سوچتی ہوئی آنکھیں
جھک گئی تھیں۔ والدین کے ہاتھ سے اسٹار کے ہی دلی تھی۔ وہ اثبات میں سرکارا ہوا تھا۔
”شریف بارو! ابراہیم نے اپنے دوست سے مرگوشی کی۔
شریف ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔“

”بارو! تیرا پتہ رات پچی کہہ گیا ہے، بارہ بج، ہم انصابی کو کیا منہ دکھائیں گے؟
شریف کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو گھور گھور دیکھ رہا تھا۔
”یہ مسلمان کون لے گیا؟ اس نے پوچھا۔“

ابراہیم ایک دولے خاموش رہ کر کہنے لگا۔

”تیرا پتہ کہتا ہے خان صاحب قرآن۔“

”اس حرام زادے کی بات چھوڑو۔“

ابراہیم نفی میں سر ہلانے لگا۔

”نہیں یاد اداں میں کچھ کالا ہے۔ پر چھوڑ دو میں کہتا ہوں انصاری کو کیا نہ دکھائیں گئے۔ کیا نہ دکھائیں گے۔ کیا نہ دکھائیں گے۔ یہی رٹ لگا رکھی ہے۔ شریف کا پارہ برابر چڑھ رہا تھا۔ راستہ بند ہے، کوئی مرگیا تو جنازہ کیسے نکلے گا؟ اس نے فقرہ مکمل کیا۔ ابراہیم کے چہرے پر سنجیدگی چھانی ہوئی تھی۔

”شریف یاد اداں! انصاری بڑا اچھا آدمی تھا۔ میری صفراں کا بیاہ ہوا تو پانچ سو روپے دے کر بولائے یا با کام پلا۔ تیری۔ بیٹی، میری بیٹی ہے۔ آکر کہے گا نہیں کہ میرا مال اسباب کہاں گیا، تم لوگ اندھے ہو گئے تھے؛ اپنے گھروں میں لے گئے ہو؟“

شریف ابراہیم کے آخری فقرے پر چونک پڑا۔ اس کے چہرے کی سرفی تبدیلی ہوئی تھی۔ اچانک اس کی قوجہ مٹا کر اسے اس پہلو پر چلی گئی جس کا اس سے پہلے اس نے خیال تک نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا: ”ہم سب کو جو دیکھ لے گا۔ بہت بڑا ہو گا۔“ نقصوں کے سحرک ہونے سے اس کی مونچھیں کانپ سی رہی تھیں۔

الودین نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس نے اینٹ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگا دی۔ بکس اٹھا کر دوسرے کونے میں لٹکادیا۔ شریف اور ابراہیم کے جوتے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے اندر رکھ دیئے اور اندر آنے لگا۔ وہ ان دونوں کے قریب آیا تو ٹھہر گیا۔

”ڈرو، ڈرو، اوپر والے سے ڈرو، اوپر والا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔“

دونوں نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا وہ آہستہ آہستہ سچن میں سے گزرتا ہوا مسجد کے آخری حصے میں چلا گیا اور جب باہر آیا تو اس نے پندرہ بیس کے قریب تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں اٹھا رکھی تھیں جنہیں وہ ایک ایک کر کے مسجد میں لٹھی ہوئی صفوں پر رکھنے لگا۔ میں تو کہتا ہوں شریف یاد خود مت کرتے ہیں۔ بلکہ کھود کر چیزیں نکالتے ہیں، قہارے گھر میں یا میرے گھر میں پڑی رہیں گی۔ کسی دن تو انصاری آ ہی جائے گا۔ ابراہیم نے کہا۔

شریف نے کوئی جواب نہ دیا، مگر اس کے چہرے کا تاثر تار پاتھا کہ اسے یہ تجویز پسند ہے۔ والدین نے آخری ٹوپی ایک جگہ رکھی اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتا ہوا پھر اٹھ چلا گیا۔

شریف اور ابراہیم نے دوسروں کو اپنے ساتھ لانے کے لئے کچھ قابل اعتماد لوگوں کو اپنی تجویز بتادی۔ جس نے یہ تجویز سنی اسی نے تائید کی اور عملی طور پر اس میں حصہ لینے کیلئے تیار ہو گیا۔ ٹھیکیدار کو بھی اس تجویز کا پتا چل گیا۔ خان صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے ہنرموع نہیں مل سکا تھا، فوراً خان صاحب کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، "خان صاحب جی! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انصاری کے برحق و درحق آپ ہی سے گئے ہیں اور باقی چیزوں کو وہ آپ سے بچانا چاہتے ہیں۔ اللہ کی لعنت ان پر، آپ کی توفیق کرتے ہیں۔"

خان صاحب کے ہونٹ لرزے لگے وہ جوابات کہنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ ٹھیکیدار نے کہہ دی تھی۔

"یہ چل ہے دس سال کی خدمت کا۔ آپ سے گلی دالوں کی اتنی خدمت کی اور آج اس خدمت کا صلہ مل رہا ہے۔"

"یہی خدمت کا چل ہے۔ خان صاحب بولے۔

ٹھیکیدار، خان صاحب کے اور قریب ہو گیا۔

"پریشان صاحب! ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں، آئے کون ملنی کا لال آتا ہے طبع بنانے، ہم مرنے نہیں گئے خان صاحب! مرا چکھا دیں گے۔"

اس روز دوسرے کے وقت شریف ابراہیم، بناء عنایت اعد چھ اور آدمی کو ایس اور علیہ وغیرہ لئے کھڑکی طرف جا رہے تھے۔ گلی کے مکالموں کی کھڑکیوں سے عورتیں انہیں دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی بار بار اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ عورتیں مسکرا

کبوں رہی ہیں۔ اور اس سکاہٹ کا راز جلد ہی ظاہر ہو گیا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ طے کے اوپر ٹھیکیدار اور دس بارہ آدمی ڈانگیں، چھڑیاں اور اینٹیں، ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں ٹھیکیدار نے انہیں آتے دیکھا تو لٹکار کر کہا:

”جنرل جرمی نے ایسی ایسی حرکت کی۔ چلے جاؤ۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔“

مشریف ابراہیم اور دوسرے لوگوں کو اس حادثے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ وہ حیران ہو گئے۔

”یادو! ہم خون خرابہ کسے لئے نہیں آئے؟“ ابراہیم نے بلند آواز سے کہا۔

”پھر کیا کرنے آئے ہو؟“ ٹھیکیدار کی آواز گونجی۔

”ٹھیکیدار جی ہم تو ایک نیک کام کرنے آئے ہیں۔ ہم تو لب صاف کرنے آئے ہیں۔ کوئی

بیچارہ بڑتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ ذکرے کوئی مر گیا تو۔“ ٹھیکیدار آگے بڑھا اور کہنے لگا:

”جو اس کرتے ہو، تم نے ہمارے خان صاحب پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں کہتا ہوں شرافت

اسی میں ہے کہ فوراً چلے جاؤ۔“

ابراہیم اور اس کے ساتھی متذہب حالت میں کھڑے تھے۔ عنایت آگے بڑھ گیا۔

”ہم وہیں نہیں جائیں گے۔ ہم لب صاف نہیں گے۔ ہم۔“

عنایت اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں دھچک بڑا رکھا تھا۔

ٹھیکیدار نے گرج کر کہا:

”دفع ہوتے ہو یا نہیں؟“

”نہیں۔ لب صاف ہو گا۔ آج ہی صاف ہو گا۔“

”اچھا تو لو۔“ اور ٹھیکیدار نے اپنی ڈانگ گھمانی جو عنایت کے پیچھے کے ساتھ زور سے

دھکائی۔ پہلے اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

”کھڑے کھڑے ہوئی جاؤں گا ذلیل کئے؟“ ٹھیکیدار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

شریف کے اندر باپ کی محنت نے جوش مارا اور وہ ابراہیم سے ہاتھ چھڑا کر اوپر جانے لگا۔
 عنایت کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔
 ٹھیکیدار نے شریف کو اوپر آنے دیکھا تو عنایت کو اس کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ
 دوکھڑاتا ہوا باپ کے پاؤں پر آگرا۔ ابراہیم بھی اوپر جانے لگا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے
 جو عورتیں جھانک رہی تھیں انہوں نے بے تحاشہ جینا شروع کر دیا تھا۔
 "خدا کے لئے دوکو۔ خدا کے لئے دوکو۔"

ان کی آوازیں بلند ہوتی ہی تھیں۔

بچے وہ لوگ کھڑے تھے جو اس معاملے میں غیر جانبدار تھے اور محض تماشا دیکھنے کے لئے
 آئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اوپر جانے والوں کو روک دیا۔ آدھ گھنٹے بعد
 طرہین کے افراد ایک دوسرے کو خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے واپس جانے لگے۔
 ٹھیکیدار جاتے ہوئے چلیج دے گیا۔
 "ایک ایک سے پٹ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔

ساری گلی کی فضا پر خوف و دہشت کی گہری دھند چھا گئی تھی۔ عورتوں نے مردوں کے
 اندر آتے ہی دروازے بند کر دیئے تھے اور شام ہوتے ہی سرور تیز دھند ہوا بھی چلنے لگی تھی۔
 تمام رات تیز ہوا کا شور برپا رہا۔

صبح ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ ہوا کی طوفانی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ اور
 پھر جب مسجد سے صبح کی اذان گونجنے لگی تو سب سے پہلے مسجد میں جانے کے لئے شریف
 نیچے اترا۔ ساری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سُوجھی ہوئی تھیں۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے یونہی اس کی نظر طے پر جا پڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی
 سیاہ سی چیز پڑی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور لمبے لمبے کی طرف جانے لگا۔

اب ابراہیم بھی نیچے اتر آیا تھا۔

”ابراہیم! وہ کیا ہے؟“ اس نے سیاہ چیرکی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہے؟“ ابراہیم نے کہا۔

دونوں لمبے پیر سیخ گئے۔ انہوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا کہ لمبہ کھودنے سے

ایک وسیع گڑھا بڑ گیا ہے اور اس کے قریب الدین اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔ بلیچر اس کے

ہاتھ میں ہے۔

ابراہیم نے ہنک کر اسے دو تین بار بلایا۔ غریف نے اسے بلایا۔ گروہ بے حس و حرکت

پڑا تھا۔

لوگ آئے گئے، لاش کو دیکھتے گئے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔

لاش ہتھالی گئی۔ لگی کے بڑوں اور بچوں نے شام سے پہلے پہلے صاف کر دیا اور

رات کے پہلے پیر جب الدین کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے صرف لگی ہی کے نہیں اور گرو

کے علاقوں کے لوگ بھی حقیقت و احترام سے سر جھکا کر چلے جا رہے تھے اور جنازہ ایک

ہموار راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔

ریڑھی

فیروز کو باپ کی موت کے بعد وراثت میں نہ تو کوئی قطعہ زمین ملا تھا، نہ مکان اور نہ کچھ نقدی۔ صرف ایک چیز ملی تھی اور یہ بھی ایک پرانی ریڑھی جو اس کے باپ کے لئے بھی روٹی کمانے کا واحد آسرا تھی اور اس کے لئے بھی ذریعہ معاش بن چکی تھی۔

اس نے باپ کو کئی بار تاروں کی پھاڑوں میں ریڑھی کو گھر سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور بیسیوں مرتبہ یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ اس ریڑھی پر طرح طرح کی سبزیاں رکھے، جڑاں روڑے سے اہر اسلام پورہ کی سڑکوں پر ریڑھی کے ساتھ گھومتا پھر رہا ہے مگر یہ خیال کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ایک روز وہ بھی اسی طرح سڑکوں اور بازاروں میں سبزیوں سے بھری ہوئی ریڑھی دھکیلنے پر مجبور ہو جائے گا۔

اپنا بچپن اور لڑکپن اس نے جہان روڑے سے متصل ملت روڑے پر گزارا تھا جہاں ایک گلی میں وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ چشتی جماعت میں اس نے سکول سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا اور یہ واقعہ اس روز ہوا تھا جب اس کے تحت گیراسٹر نے سبق یاد نہ کرنے پر اس کی بڑی طرح پٹائی کی تھی اور وہ روٹا ہوا زخمی حالت میں گھر پہنچا تھا۔ اس کے بعد سکول کے نام ہی سے اس پر لڑھکھادی ہو جاتا تھا اور ماں باپ کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے سکول کی طرف رُخ نہ پھیرا۔ ماں باپ کیا کرتے۔ ان کا قوی چاہتا تھا کہ ان کا بیٹا کوئی عزت و آبرو کی نوکری کرے مگر یہ اس کی قسمت ہی میں نہیں تھی۔

باپ نے اُسے ایک کلا تھ مرچنٹ کی دکان پر بٹھا دیا کہ کسی روز اپنے پیروں پر کھڑا ہو

جائے گا لیکن اس کا دل یہاں نہ لگا۔ صبح سے لے کر شام تک ایک جگہ بیٹھے رہنا یا لگا ہوں
کے سامنے تھان کھول کھول کر قیمت پر بحث کرنا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ وہاں ایک مہینہ بھی
نہ گزار سکا اور دکان پر مشق کے لئے چھوڑ کر گھر آ گیا۔

باپ نے کئی اور دکانوں پر بھی اسے بھیجا مگر تک کر بیٹھا اس کے بس کا دلگ نہ تھا۔
نتیجہ یہ کہ باپ اس سے ایسے ہو گیا اور اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تین برس کی مدت اس طرح گئی کہ فیروز کا باپ ریڑھی لے کر تنہا منڈی جاتا
کیونکہ اس وقت فیروز سویا ہوا مگر جب منڈی سے واپس آتا تو بیٹے کو بھی اپنے ہمراہ لے
جاتا۔ فیروز ریڑھی کے ساتھ ساتھ چلتا، کسی گھر کے دروازے پر کوئی عورت کوئی ترکاری طلب
کرتی تو یہ ڈیوٹی فیروز کی ہوتی کہ وہ ترکاری نکال کر عورت کے حوالے کرے اور اس سے پیسے
وصول کر کے باپ کو لا کر دے!

اس کام سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ریڑھی کو دھکیلے رہنا
اس کے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا مگر اپنی سبزیوں کا بار بار اعلان کرنا اور لوگوں کو ان کی
قرودازی سے مطلع کرنا اس کے لئے قدرے دشوار امر ہو گیا تھا۔ بہ فرض بھی فیروز ادا کرتا تھا۔
جیسے ہی ریڑھی گھر کے قریب پہنچتی اور باپ پہلی آواز لگاتا، گو بھی، مٹرا، آلو، تازہ سبزیاں،
تو وہ مجبوراً بستر سے نکل کر باہر آ جاتا اور دوسری آواز اس کے حلق سے نکلتی۔

باپ بیٹا گھر میں ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ مولاداد کی دکان پر نان سوی پالنے اڑاتے۔
بس یہی ایک ایسی شق تھی جس سے فیروز کو دلچسپی تھی۔

بوڑھا باپ طرح طرح کی بیماریاں پال رہا تھا۔ اندر ہی بیماریاں تیزی سے اسے قبر کے
قریب لے جا رہی تھیں اور آخر کار لے ہی گئیں۔ ماں بھی چھ ماہ کے بعد دنیا سے چلی گئی۔

باپ کے مرنے پر تو فیروز کی ماں نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر جو رقم جمع کی تھی اس سے
مغربی اوقات ہوتی رہی۔ وہ مر گئی تو فیروز بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ ماں جاتے ہوئے اسے ڈیڑھ سو

روپیہ دے گئی تھی، اس میں سے دو ماہ کا کرایہ دینے کے بعد فیروز کی جیب میں پھیلاؤ سے روپے بچ گئے تھے۔ دس روڑ گھر میں بیٹھا تو تیس روپے اور خرچ ہو گئے۔ بچلے کے بارگاہوں نے بھجایا۔ فرجے! خرچ کرنے سے تو تاروں کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ کام کاج کر۔ کب تک گھر میں بیٹھا رہے گا؟ یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ فیروز اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ حاجی غلام جیلانی کا شاد مار مکان اس کے گھر کے قریب واقع تھا اور حاجی صاحب کی دو دوکانیں تھیں، اور دونوں میں سبزیاں بکتی تھیں۔ فیروز کا باپ جب بھی اپنے کسی گاہک سے سنتا تھا: حاجی جی! ترکاری بہت ملے گی، بیچتے ہو: تو وہ بڑی حقارت سے کہتے تھے: یہاں صاحب! سنسنی کھانی ہے تو جلال کی ریڑھی پر جاؤ! یہاں جیسی سبزی ہو گی ویسے دام بہئے۔ یہ حاجی صاحب ایک روز فیروز سے ملے اور بولے:

”فرجے! باپ کی طرح ریڑھی چلائے گا یا بھلے مانسوں کی طرح میری دکان پر کام کرے گا؟ حاجی صاحب نے گویا اس کے مرحوم باپ کو بھلے مانسوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ اس نے باپ کی توہین محسوس کی مگر یہ زہر چکے سے پی گیا اور ادب سے بولا۔“

”حاجی جی بہرانی!“

حاجی صاحب سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ وہ گھر آیا تو اپنی چار پائی پر گر پڑا۔ اس کے سر میں درد تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ میں افتاد ہوا تو اس نے اٹھ کر گھر کے میں سے گلاس بھر کر پانی پیا۔ گلاس گھر کے پردہ کو لٹکا کر اس کی نظر ریڑھی پر پڑی جو اس کے باپ کی چار پائی کے قریب پڑی تھی۔ اس کا باپ اپنی ریڑھی سے بہت پیاد کرتا تھا۔ گھر کے اندر رکھنے میں گھردلوں کو چلنے پھرنے میں کافی دقت ہوتی تھی اور فیروز کی ماں نے کئی بار اس کے باپ سے بھی اصرار کیا تھا۔

فرجے کے ابا اسے باہر رکھا کہ وہ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتی ہوں۔ کوئی چور نہیں

لے جانے لگا:

فیروز کے باپ کو یہ ڈر نہیں تھا کہ ریڑھی کو کوئی چور کر لے جائے گا لیکن ایک قواسی
بارش سے خراب ہو جانے کا خدشہ تھا اور دوسرا ڈر یہ بھی تھا کہ محلے کے بچے اس کے اوپر چڑھ
کر اور جسم بچائیں گے اور اس کا ستیاناس کر دیں گے۔ اس لئے وہ بیوی کی بات ماننے کے لئے
تیار نہیں تھا اور نہ ہی کبھی تیار ہوا۔

یہ ریڑھی اس کے باپ نے اپنی جوانی کے عالم میں خریدی تھی اور چونکہ اسے بہت
حفاظت اور احتیاط سے رکھا تھا۔ اور دو تین بار دنگ و دغ بھی کر دیا تھا۔ وہ پرانی
دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ لگتا تھا کہ صرف تین ماہ پہلے جوانی گئی ہے۔

وہ کئی لمبے ٹیکنگی باندھ کر ریڑھی کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے اس کے مرحوم باپ کی شکل
بھرنے لگی۔ وہ بڑھاپے میں کتنی وقت سے ریڑھی دھکیل دھکیل کر آگے لے جاتا تھا اور جب
کسی کو اپنی طرف آنے ہونے دیکھتا تھا تو خوراک جاتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ الفاظ
بھی گونجنے لگے جو وہ ریڑھی کے ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز میں کہتا تھا۔ گو بھی، آلو، مشر تانہ
سبزیاں یہ آواز سن کر اور گرد کے گھروں کے دروازے کھلنے لگتے تھے اور ان دروازوں پر
عورتیں اور بچے لڑکیاں اٹھائے آ جاتے تھے اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بازار
میں سے گزر رہا ہے اور گھروں کے دروازے کھل رہے ہیں۔

وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ ریڑھی کے پاس گیا اور بیڑا دے کے اس پر ہاتھ بھرنے
لگا۔ شفاف ٹکڑی کے لمس سے اس کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے وہ ٹکڑی ایک
جاندار وجود ہو جو سوالیہ نظروں سے اسے مسلسل دیکھ رہا ہو۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساری نقدی نکال کر ریڑھی پر ڈھیر کر دی۔ مایوسی کے
عالم میں اس کے چہرے پر سیاہ سائے سے منڈلانے لگے۔ وہ ریڑھی سے الگ ہو کر ٹھوڑی دیر
الٹاری کے قریب چلا گیا وہ کبھی کبھی دیکھا کرتا کہ اس کی ماں اس الٹاری کے سب سے نچلے

خلنے میں پکڑوں کے نیچے سے ایک سیلا کھیلا رومال نکالا کرتی اور اس کی گانٹھ کھول کر ایک روپیہ نکال کر اسے دے دیتی اور پھر گانٹھ باندھ کر رومال کو وہیں رکھ دیتی جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔

یہ روپیہ وہ اپنے شوہر سے چوری بیٹے کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے سکے لئے دیا کرتی تھی، جہلال کو اپنی بیوی کی یہ حرکت پسند نہیں تھی۔ وہ کہا کرتا تھا: عیثاں! یہ فضول خرچی ہے تمہارا مال کا ناخاک نہیں اور تم اسے پورا ایک روپیہ دے دیتی ہو گو عیثاں بیٹے کو ناانیدہ نہیں کرتی تھی۔

فیروز نے امدادی کھولی ماں کی ذمات کے بعد اس نے کئی بار کپڑے نکاتے کے لئے یہ امدادی کھولی تھی لیکن رومال کی طرف کبھی اس کا خیال نہیں گیا تھا اس نے ہم دور جا کی حالت میں سب سے پہلے خلعے کے پکڑوں میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے میں وہی سیلا کھیلا رومال اس کے ہاتھ میں تھا۔

رومال میں گانٹھ دیکھ کر اس کا دل بیسوں آچھلنے لگا بے صبری سے اس نے گانٹھ کھولی۔ چند نوٹ نظر آنے لگے۔ یہ نوٹ گن کر اس نے نقدی کے اوپر رکھ دیئے اور رومال اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ان نوٹوں نے نقدی میں چالیس روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔

”اماں تم کتنی ابھی تھیں“

اس کے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے اور اسے اچانک یہ سوچ کر پیشانی ہوئی کہ اس نے اپنی ماں کو کوئی سکھ نہیں دیا تھا۔

دوسرے روز صبح جب ٹھیکیدار علی احمد کے مرنے کے باگ دی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس صبح اس نے اپنے باپ کی طرح سارے کام کئے پہلے ایک کپڑے سے ریڑھی کو صاف کیا، پھر کپڑا گھٹا کر کے اس پر بھیرا۔ دو دانے کے دونوں ہٹ کھوئے۔ ریڑھی کو باہر لے آیا

اور دروازے کو قفل کر دیا۔

جب اس کے ماں باپ زندہ تھے تو جس وقت اس کا باپ ریڑھی کو دروازے سے باہر نکالتا تھا۔ تو اس کی ماں ضرور دروازے پر آجاتی تھی اور تین چار مرتبہ زبانیز کریں۔ کہتی تھی اور اس وقت تک دروازے پر کھڑی رہتی تھی جب تک اس کا شوہر گلی کے آخر تک نہیں پہنچ جاتا تھا۔ اب کوئی زبانیز کریں۔ کہنے والا نہیں تھا۔ ذکھ کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں سوار ہو گئی۔

مولاداد کی دکان میں سٹول پر بیٹھ کر جب اس نے گرم مان کا لقمہ توڑ کر خود بے میں ڈالا تو اسے تنہائی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کبھی لمحے لقمہ تک نہ لے پاسکا۔

گھسنے ڈیرا گھسنے کے بعد وہ زور لگا کر بازاروں میں ریڑھی دھکیل رہا تھا سبزی منڈی سے بھری رقم خرچ کر کے وہ جتنی ترکاریاں خریدا کر لایا تھا ان سے ریڑھی اس طرح بھری نہیں تھی جس طرح اس کے باپ کے زمانے میں بھر جایا کرتی تھی۔

بازاروں سے گزرتے وقت اس کے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔

”اللہ قری شان۔ واہ وا آگیا باپ کے رستے پر۔ سبحان اللہ کاوشا آیا ہے۔“

ٹھیکیدار علی احمد نے اسے دیکھا تو دھوپ کی وجہ سے آنکھوں پر لمبھٹوں کا سایہ کر کے بولا۔
”جھنس گئے بیٹا! پیٹ بڑی ہل ہے۔“

باپ کی زندگی میں جب ریڑھی کسی بازار میں سے گزرتی تھی تو ارد گرد کے گھروں کے دروازے کھلنے لگتے تھے مگر اب شافو نامور ہی کوئی دروازہ کھلتا تھا۔

ایک بجے کے قریب اس کی ریڑھی پر صرف چند خراب آلوؤں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا اور وہ خوش تھا۔!

اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اماں شاماں کا شور تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ اس شور سے روٹی کھا رہا تھا۔

خود کے پاس آکر اس نے ریڑھی اٹھ جواہل کے مکان کی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور اپنے کرتے کی دونوں بھری ہوئی جیبوں کے ساتھ اس پھٹے پرانے بورپے کی طرف تدم اٹھانے لگا جس پر مزدور اور غریب غزبا بیٹھ کر پیٹ بھرا کرتے تھے۔

پیٹ بھر کر وہ ریڑھی لے کر گھر کے آگے جاڑکا۔ جیب سے چابی نکالی۔ دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ ریڑھی کو اندر لے گیا۔

گھر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں پی گیا اور بادی بادی دونوں جیبیں ریڑھی پر خالی کر دیں۔ رقم گنی تو انیس روپے چار آنے کا نافع ہوا تھا۔ باپ کے زمانے پر نفع اصل رقم سے بھی بڑھ جاتا تھا تاہم وہ خوش تھا۔

اس کے محلہ والوں کو یقین تھا کہ یہ کماتا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک رہے گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر ایسے ہوتے جا رہے تھے کہ فیروز نے باپ کی جگہ لی تھی اور وہ باپ کی سہی مستعدی کے ساتھ کام کر رہا تھا اس کی ماں کا پرانا ردال جو اب اس کی جیب سے نکل کر الماری کے سب سے پچھلے خانے میں کپڑے کے نیچے چھپا رہتا تھا اس میں ایک کی بجائے چار گانٹھیں پڑ چکی تھیں۔ ان گانٹھوں کے اندر نوٹ تھے۔ کتنے وہ انگ کانسی کے ایک ایسے برتن میں ڈالتا جاتا تھا جہاں کی جا رہائی کے قریب ایک طلبہ میں اس مقصد کے لئے رکھا رہتا تھا۔

پانچ بیسے گزرنے پر اس کی وہی حالت ہو گئی جو اس کے باپ کی تھی۔ اب منڈی میں ترکاریاں لے کر بازاروں میں سے گزرتا تھا تو مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے اور بارہ بجے تک ساری ریڑھی خالی ہو جاتی تھی۔ گھر واپس جاتا تھا تو ایک ان جان اٹا سی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ تنور سے پیٹ بھرنے کے بعد وہ کبھی غصے کی دکان پر جا بیٹھتا تھا اور کبھی نسیم طرائف کی دکان کے پاس اس پنچ پر جو گاؤں کے لئے مخصوص تھا، نیم دراز ہو جاتا تھا۔ شام تک اسی طرح وقت

بتا کر وہ پھر خود سے روٹی کھانے کے بعد گھر آکر چارپائی پر لیٹ جاتا تھا اور گھٹنے آدھ گھٹنے تک کرڈ میں بدلتے کے بعد سو جاتا تھا۔

دن پر دن بیت رہے تھے اور اس کی الماری کے سب سے پچھلے خانے میں کپڑوں کے نیچے نوٹ، اسی نوٹ، بکھرے پڑے تھے یہ ان نوٹوں کے علاوہ تھے جو دو مال کے چادروں کوٹوں میں بندھے ہوئے تھے۔

اس روز غفور سے کی مکان پر کوئی گلاہ نہیں تھا اور فیروز اس کے قریب سٹول پر بیٹھا تھا۔ غفور سے نے سنی میز نظروں سے اسے دیکھا اور خود بخود مسکانے لگا۔

فیروز اس کی سکواہٹ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بولا:

”کیوں غفور سے بات کیا ہے؟“

غفور ا کہنے لگا۔

”یاد آ پیدویر ٹھیک ہے نا اپنے پاس؟“

”کیا پیسہ دیر؟“ اس اللہ کا فضل ہے۔“

”خودوں کی روٹیاں کھاتے کھاتے بے زار نہیں ہو گئے۔“ میں تو دس روپے بھی نہیں کاتا، صاحب میری شادی ہو گئی تھی۔ کہو تو کچھ کروں؟“

”کیا کرو گے؟“ فیروز نے ہنس کر پوچھا۔

”یہ بات ہم پر چھوڑ دو۔“

اور دوسرے روز مانی حیدواں اس کے گھر میں بیٹھی تھی اور وہ جانتا تھا کہ مانی کا کام رشتے کا نام ہے اور غفور سے نے اسے اس کے گھر بھیجا ہے۔

حیدواں نے باتوں باتوں میں کچھ لیا تھا کہ آسامی ابھی ہے۔ کسی غریب گھرانے کی لڑکی اس کے گھر آکر اپنے ماں باپ کی محتاج نہیں رہے گی۔ خود ڈی دیر بعد اٹھتے ہوئے بولی۔

”بس ٹھیک ہے۔“ دھوڑتی ہوں، اللہ نے چاہا تو میرے جیسی لڑکی ملاؤں گی تمہارے لئے۔“

اب ذرا سنبھٹھا کر اوسے :-

وہ سمجھ گیا تھا کہ حمید اُن کا لنگ رہی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے روپے مناسب رہیں گے حمید اُن نے اس کا چہرہ دیکھ کر بھانپ لیا کہ کیا سوچ رہا ہے۔
 ”پندرہ برس تو دے دے نا۔“

اس نے ایک لفظ کہے بغیر حسیب سے برس روپے لکالے اور حمید اُن کے حوالے کر دیئے اور وہ رعائش دیتی ہوئی پتلی گئی۔
 چوتھے دن ہی وہ آگئی۔

”خوب ہے! ایسی لڑکی ڈسٹوڈی ہے کہ سارے شہر میں نہیں ہوگی شریف ماں کی شریف بیٹی
 خوبصورت، ناز و دوز سے کی پابند، سنگھڑا گھر بلو۔
 فیروز خوش ہو گیا۔

”پراناں ہے کون؟“

”بتا دوں؟“

”بتاؤ گی کیوں نہیں؟“

حمید اُن نے کاغذ کی پڑیا کھول کر پاں میں ڈالا اور انگلیوں سے وہ سرخ سرخ لکیریں
 پر پھینے لگی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی کر ٹھوڑی کی طرف نکل گئی تھیں۔ فیروز بے تاب سے
 اس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”اناں بتاؤ نا۔“

”بے صبرے نہ بنو۔ بتاتی ہوں۔ وہ اپنا اکبر علی ہے نا۔“

”وہ جس کی چھوٹی سی دکان لڑکیوں کے کھل کے پاس ہے۔“

حمید اُن کو یہ بات بڑی لگی۔ اس کے ہاتھ پر تیریاں پڑ گئیں۔

”چھوٹی دکان ہے تو کیا ہوا۔ پندرہ برس روپے دوز کا لیتا ہے۔ تمہاری اپنی ذات کا ہے۔“

مکان اپنا ہے — چیز بھی دے گا — بولو ہاں کر دوں تمہاری طرف سے؟
 فیروز اپنی بیٹائی پر دائیں ہاتھ کی انگلی پھیرنے لگا۔
 "ااں! سوچ کر بتاؤں گا۔"

• کل دوپہر آؤں گی؟

حیدر علی گئی تو وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ تین مرتبہ وہ سانپوں
 رنگ کی ایک بے قد قناعت کی لڑکی کو اکبر علی کے گھر کے دروازے پر دیکھ چکا تھا۔ ریڑھی تک
 نہیں آئی تھی، وہ اس سے سبزی کا نام لیا تھا، اور فیروز یہ سبزی تول کر خود اس کے پاس گیا تھا اور
 جتنے پیسے مانگے تھے وہ اس نے خود اسے دے دیئے تھے۔ بھاذ پر کوئی ٹکار نہیں کی تھی۔ کئی بار سونے
 سے پہلے فیروز نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا تھا۔ کتنی شرمیلی ہے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف
 نہیں دیکھا تھا۔ جو بھاؤ بتایا ان گنی پیسے کم کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی۔ یہ لڑکی میری بیوی
 بن جانے کی تو ٹھیک رہے گا۔

فیروز کو یہ خیال کچھ عجیب لگا اور فوراً اس سے دل پر ایسی چھا گئی۔ اکبر علی کو بہرہ رشتہ منظور
 نہ ہوا تو بے اضطراب کے عالم میں وہ بستر پر بار بار کروٹیں مینے لگا۔

صبح منڈی سے سونامے کو وہ جب اکبر علی کے مکان کے سامنے پہنچا تو اس کا دل دھڑک
 رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح بلند آواز میں نہ کہہ سکا۔ کرلیے، ٹینڈے، آلو، تازہ سبزیاں، لاکھوں کو
 ان کی پسند کی ترکاریاں دیتے وقت وہ کہہ کر کنکلیوں سے اکبر علی کے دروازے کو بھی دیکھ
 لیتا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے اور وہ دروازہ نہ کھلا۔

ریڑھی کے پاس کوئی لاکھ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بے اختیار یہ آواز ابھر آئی کہ وہ
 آجائے تو کتنا اچھا ہو۔ پہلے اسے کبھی ابھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ آج دیکھ لوں گا۔ اسے خود
 اپنی حرکت کا علم نہ ہو سکا اور اس کی ریڑھی اکبر علی کے دروازے سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر
 پہنچ گئی تھی۔ اس نے آواز لگائی، کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ رہا ہو۔

پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ اس میں سے ایک ہتھ نکلا اور نفی میں ہلرا کر غائب ہو گیا وہ پھر ریڑھی کو دیکھ لے گیا۔

اس رات وہ اتھار بار اس کے چہرے کے قریب ہلرا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سایہ ڈال دیتا تھا۔ ایک مورچ نشا طین کر اس کے دل کو جھو جاتا تھا۔

صرف میں دن میں سب کچھ ہو گیا۔ اکبر علی اور اس کی بیوی اپنی صفائی کی بڑھتی عمر دیکھ کر ایک خوف کے زیر اثر اس بات کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ کوئی دن کی لڑکی کا رشتہ مانگے اور وہ خود راہیں کہہ دیں۔

خاموش خاموش نظروں والی اور شرم کے مارے اپنے ہی وجود میں گم ہو جانے والی صفائی اس کی بیوی بن گئی۔ اس کے آنے پر فیروز نے غصوں کیا کہ اب اس کے گھر میں وہ بے ہنگامی اور اضطراب کی نہیں رہی جس کا احساس کچھ مدت سے ہر روز سونے سے پہلے اس کے رگ و پے میں اتر جاتا تھا صفائی نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا شادی کی پہلی رات کے بعد جو صبح طلوع ہوئی فیروز نے ریڑھی کی ہتھی پر اتھار رکھنے سے پہلے الماری کھول کر اس کے پچھلے خانے میں پکڑوں کے نیچے بستے نوٹ بکھرے پڑے تھے سب اس کے حوالے کر دیئے تھے۔
تم جانو اور تمہارا کام۔

فیروز کو یقین تھا کہ یہ دولت دیکھ کر اس کی بیوی بہت خوش ہو جائے گی۔ مسکرا اٹھے گی فرط مسرت میں اس سے پٹ چلے گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔
نوٹوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو اس نے صرف یہ پوچھا۔
کتنا؟
نظا ہرے اس کا مطلب تھا یہ سارا کتنا رو پیہ ہے۔
میں نے کبھی گنا نہیں؟

یہ جواب سن کر صغریٰ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے کبھی جالا نہیں لگایا تھا۔۔۔ اؤں؟“

صغریٰ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

فیروز نے ریڑھی گھر سے نکالی اور دروازے پر دنگ کر بولا۔

”بھوتو نہ جاؤں؟“

صغریٰ نے نہیں سن کر ہلایا تھا یا ہاں میں، وہ سمجھ نہ سکا اور منٹائی جاتے وقت یہ سوال

کئی بار اس کے ذہن میں جاگ اٹھا تھا۔

منٹائی سے سوراخے کر جب وہ مولادو کی دکان کے سامنے آیا تو اسے اٹھنے کا خیال آگیا

مولادو نے لمٹھ بڑھا کر وہ سٹل اپنے قریب کھسکا لیا جس پر فیروز بیٹھ کر ناشہ کیا مگر اتحاد لیکن

اب تو وہ تنہا نہیں تھا، گھر میں ایک اور سچی بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے مولادو سے برتن لے کر اسے سانے سے بھرا لیا، چادر گرم گرم نان اپنی بھل کے

نیچے دبا لئے اور گھر کی طرف جانے لگا۔

دروازہ بند تھا۔

دروازے پر دنگ دینے کی بجائے اس نے آواز لگائی: ”کر لے، ٹینڈے، آؤ، نانہ بڑھائے“

دروازہ بند نہ ہو، منٹ کے بعد ایک پٹ دھڑا سا کھلا اور اس میں سے ایک لمٹھ

نکل کر بھرا گیا۔

فیروز کو یہ اور اتنی پسند آئی کہ اس نے فوراً دروازے میں سے گزر کر دروازے کی صغریٰ کو

اپنے سینے سے لگا لیا اور اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ نان اس کی بھل سے نکل کر نیچے گر پڑے یا

”یہ کیا ہو بھولی، اور اس نے نان اٹھائے؟“

”سان ادھر ہے، اور فیروز، ریڑھی پر سے برتن اٹھا کر لے آیا۔“

”یہ کیوں؟ کیا گھر میں کھانے کی چیزیں باہر سے آئیں گی؟“

”ٹھیک ہے اب جیسا کہ ہوگی۔ اب تو تیار راج ہے، فیروز مسکرا دیا۔

فیروز کی زندگی میں بڑی باتامعذگی آگئی تھی۔ صغریٰ کوئی کام اسے بے تاملگی سے کرنے نہیں دیتی تھی۔ وقت پرناخشہ، وقت پر دہرہ پرکا کھانا اور وقت پر ہی رات کا کھانا۔ شادی کے بعد اسے ایسی راحت ملنے لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، گریبوں میں وہ کمرے ہی میں سوتے تھے۔ صغریٰ جب تک جاگتی رہتی تھی اسے پکچھا بھلا رہتی تھی۔

گھر میں پہلی نہیں لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، صغریٰ نے پیسے جمع کر کے وارننگ کر دینی اور کمرے کے اندر شام ہی سے بجلی کا بلب روشن ہونے لگا۔ پہلی کا پکچھا بھی آ گیا۔ گریبوں پر بیت گئیں، سرویوں کا آغاز ہو گیا صغریٰ ہر کام بڑی تیزی سے کیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ سست سست نظر آتی تھی۔ فیروز کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ یوں سے پرچتا تھا تم بیمار ہو کیا؟

”نہیں وہ منہ پھیر کر جواب دیتی

”پھر سست کیوں ہو گئی ہو؟“

”یہ ایک راز ہے؟“

اور یہ راز چند ماہ تک ہی راز رہ سکا۔ گھر میں ایک مہمان آ گیا تھا۔ . . . یہ مہمان ایک خوبصورت، پیاری سی بچی تھی جس کا نام فیروز نے نہینت اور صغریٰ نے نازیہ رکھ دیا تھا۔ صغریٰ کا رکھا ہوا نام زیادہ سرا مل گیا اس لئے فیروز نے بھی یہی نام قبول کر لیا۔ فیروز کی گھر سے باہر کوئی حیثیت نہیں تھی، مگر گھر میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک کنبے کا سربراہ تھا اور کاکر گھر کے سارے اخراجات پورے کرتا تھا۔

یہ کنبہ بظاہر تین افراد پر مشتمل تھا لیکن اس میں ایک اور فرد بھی تھا۔ تین افراد تو جاننا دے تھے، فیروز صغریٰ اور نازیہ اور یہ فرد بے جان تھا اور دیر بھی کی صورت میں تھا۔ جب تک فیروز کی ماں زندہ تھی وہ اپنے شوہر سے بھی کچھ نہ کہتی تھی کہ اس کو بددعا دے سے باہر رکھا

کر دیکر فیروز کے باپ نے اس کی یہ بات کبھی نہیں مانی تھی اور اب صفائی کو امراد تھا کہ
ریڑھی کو باہر دھنا چاہیے اس نے آدھا کرو گھیر رکھا ہے اور اپنے باپ کی طرح فیروز بھی اس
کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔

فیروز کو اپنی ریڑھی سے بڑی محبت تھی، جھوٹے دوستوں کے لئے اسے دھتا تھا اور
پرانے اخبارات، ہٹا کر اپنے پیڑھی بابا احمد دین کے گھر سے نئے اخبارات لا کر اس پر
پھیلا دیتا تھا۔

نازی ساڑھے تین سال کی ہو گئی تھی۔ وہ ریڑھی کے اوپر بیٹھ کر اپنی گلیوں کے ساتھ کھیلا
کرتی تھی اور وہیں بیٹھ کر ناشتہ بھی کرتی تھی۔ دہائی بھی کھاتی تھی۔ باپ کے منہ کوٹنے کے
باوجود اس سے بچے نہیں اترتی تھی۔

اور وہ جھوٹے صبح تھی، جب نازی بڑی جلدی جاگ کر ریڑھی پر جا بیٹھی تھی۔ گریوں کے
دن تھے، صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

فیروز نماز پڑھ کر آیا تو اس نے بیٹی کو ریڑھی کے اوپر چلے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔
"سیر کر رہی؟"

نازی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

فیروز ریڑھی کو باہر لے جانے لگا۔

نازی پہلے تو چند لمحے ڈر کے مارے چلی اور پھر ہنسنے لگی۔

فیروز نے اس دن نازی کو کافی ہرنگ سیر کرائی اور جب گھر واپس آ کر وہ ریڑھی سے
بچے اترتی تو بہت خوش تھی۔

"اگلے جمعہ جس بھی نے جائیں گے، یہ فقہ فیروز نے صفائی سے کہا تھا۔"

ریڑھی پر صفائی نے حیرت زدہ ہو کر پڑھا۔

کہاں

”پاگل تو نہیں ہو گئے؟“

اگلے جمعہ کی صبح کو جب سورج کے طلوع ہونے میں کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا، فیروز نے ذہن نشی صغریٰ کو درٹھی پر بٹھالیا۔ نازی تو خود بخود ہنستی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔

درٹھی گھر کے دروازے سے دریا دور گئی تو صغریٰ کا شرم کے مارے بنا حال ہو گیا۔ وہ بار بار کہتی تھی: *لے اللہ، اونی اللہ میں مر گئی*۔

”بھینچی کیوں سو۔ ادھر آدھ کر کوئی ہے؟ فیروز نے غصے سے کہا۔

صغریٰ شرم سے اپنے آپ میں ڈوبی جا رہی تھی اس کے برعکس نازی بہت خوش تھی جیسے دکھ ہی تھی۔ تالیاں بجا رہی تھی۔

آدھ گھنٹے کے بعد درٹھی واپس دروازے پر آ گئی۔ صغریٰ چھٹانگ لگا کر اندر چلی گئی۔

”بڑے بے شرم ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے؟“

فیروز نے بیوی کے یہ الفاظ سن کر چند لمے اسے گھور کر دیکھا۔

صغریٰ اہارے پاس مور نہیں ہے۔ مانگ بھی نہیں۔ یہی ہمارے لئے موٹا اور مانگ ہے۔

صغریٰ نے اسے ہٹ کر دیکھا۔ نہ جانے اس کے شوہر کے چہرے پر کچھ اپڑا سزا جھبے نے

اپنے گہرے دنگ پھیلا دیئے تھے کہ وہ چپ چاپ ان بکھرے ہوئے رنگوں کو دیکھتی رہی تھی وہاں تک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی پکیں آنسوؤں سے بو بھیل ہو گئی ہیں۔

”تم دو رہی ہو صغریٰ؟“

”نہیں۔ نہیں۔ اور صغریٰ اپنے سر پٹے کے پڑے آنسو پونچھنے لگی۔

فیروز ہر لمحے کو صبر سے چل رہا ہو کر بیوی کے سر پٹے کھڑے ہو کر دود سے کہتا۔

”موٹا سر کے لئے تیل ہے یہ صاب؟“

صغریٰ پہلو بدل کر جا کر اپنے پورے جسم پر پھیلا رہی اور چہرہ بھی ڈھانسی رہی۔ نازی جو

ماں کے ساتھ ہی سوتی تھی اچھا بابا کہہ کر چادر پانی سے اٹھ بیٹھی۔

”نازی! تم تو تیار ہو مگر تباری ماں، دیکھو کیا کر رہی ہے۔ فیروز نے صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“

نازی ماں کے چہرے سے چادر ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

”اٹھو نا اسی موڑ میں بیٹھ کر میری نہیں کرنی!“

”دفع دود، یہ موڑ ہے!“

فیروز اس پر ایک لفظ بھی نہ کہتا۔ خاموش کھڑا رہتا۔ صفائی چہرے سے چادر ہٹا کر اپنے شوہر کو دیکھتی اور کہنی لمبے دیکھتی رہتی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آتا کہ آہستہ آہستہ چادر الگ کرنے لگتی اور نکلیات آہستہ آہستہ بچے میں کہتی۔

”تم تاشا دکھاؤ گے لوگوں کو۔“

”تاشا کیسا۔ اپنی موڑ ہے؟ فیروز ہنس پڑتا۔“

چار پانچ بار ریڑھی پر بیٹھ کر سر کرنے کے بعد صفائی کی پیل کی جھجک دودھ جھنکی تاہم وہ شوہر کے اصرار پر ریڑھی پر بیٹھتی تھی۔

گرمیاں ختم ہو گئیں تو سر کا پردہ گرام بھی ختم ہو گیا۔

اس روز فیروز بارہ بجے گھر آیا۔ اور اس نے اپنے معمول کے مطابق گوبھی آلو، سبز تازہ ٹکایا کی آواز نہ لگائی تو نازیہ دودھ سے پرہیز آئی۔ باپ کی آواز سن کر وہ ضرور گھر سے باہر آجاتی تھی۔ فیروز کو بیٹی کی شکل دکھائی نہ دی تو اس نے زیر لب کہا اللہ تباری جب وہ منڈی کی طرف جانے لگا تھا تو اس کی بوری نے بتایا تھا۔ تازہ کو سوری لگ گئی ہے۔ ہزاروں میں سے گزرتے وقت اسے بیٹی کا خیال نہ کیا مگر اب اسے نہ دیکھ کر وہ ٹھکر مند ہو گیا۔

کمرے کے اندر جا کر اس نے دیکھا کہ نازی چادر پانی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اس کی ماں پاس بیٹھ کر اس کا سر دبا رہی ہے۔

”قے پرتے کر رہی ہے؟ صفرائی نے شوہر کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”نہیں — چلے پلائی ہے۔“

فیروز بیٹی پر ہنک گیا۔

”نازد بیٹی! کیا ہے؟“

”پتہ نہیں — بابا۔“

”بارہ بج چکے ہیں۔ ڈاکٹر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک رہتے ہیں — لے جاتا ہوں؟“

فیروز نے نازیہ کو گود میں اٹھایا اور قریبی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف جانے لگا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

”اسے نمونہ ہو گیا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔“

فیروز کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ مولانا داد کے بیٹے کو بھی نمونہ ہو گیا تھا

اور وہ مر گیا تھا۔

اس نے نازیہ کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر پیسے سے لگا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں دوا تھی اور

دوسرے ہاتھ میں غبارہ جو اس نے کلینک سے باہر نکل کر خریدا تھا۔!

تین دن اور تین راتیں بیاں پوری نازیہ کے قریب بیٹھے رہے۔ سارے چھ روز وہ

چپ چاپ چلی گئی۔

نازیہ کے چلے جانے کا صفرائی کو بڑا صدمہ پہنچا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ کہہ رہے تھے

وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہنے لگی۔ فیروز چار دن تک منڈی نہ جاسکا۔ پانچویں روز

صفرائی نے مجبور کر کے اسے بھیج دیا۔

تین ماہ گزر گئے۔

صفرائی گھر کے کاموں میں برابر بیٹھی رہتی تھی۔ وہ کوئی کام بھی بے قاعدگی سے نہیں کرتی

تھی مگر فیروز عسوی کر رہا تھا کہ وہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی چُپ کی رہتی ہے اس سے بہتر
پرچھتا، صغریٰ نہیں کیا ہو گیا ہے، کیا تکلیف ہے نہیں، صغریٰ ہر بار یہی کہتی تھی، میں بالکل
ٹھیک ہوں، نہیں دہم ہو گیا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ایک دن وہ بیوی کو مجبور کر کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا، ڈاکٹر نے سٹیکوپ لگا کر اس کا
معائنہ کیا اور کہا۔!

”فیروز! میں نے جاؤ؟“

”کیوں ڈاکٹر صاحب؟“

”کہہ جو دیا ہے جاؤ؟ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔
راتے میں بیاں بیوی خاموش رہے، گھر پہنچ کر جب فیروز نے صغریٰ کو تانگے سے اُتارا
اور سہارا دے کر اندر لایا تو وہ بولی۔

”میں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔“

”ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کیوں نہیں جاؤ گی؟“

”بکے تو کہتا رہے، مرنا ہے تو گھر میں مروں گی، ہسپتال میں نہیں رلوں گی۔“
اور صغریٰ گھر ہی میں مری، جموات کی صبح کو اس کا باپ ایک مقامی ڈاکٹر کو گھر لایا جس
نے تاکید کی کہ اسے فوراً ہسپتال میں لے جاؤ۔۔۔ جب اس کا شوہر اور بیٹے کو لے لوگ اسے
ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو فیروز نے جھک کر اسے دیکھا اور بیٹے پر دو ہنڈیاں مار کر
لے لے کر بھاگا، بس میں دائیں طرف کمری پر گر پڑا اور اس کے ساتھ گھر میں کھرا م بھاگا۔
اب اسے گھر خالی خالی لگتا تھا، اور اس دیواریں ہر طرف بے رونق تھیں، کہیں کوئی چہرہ نہیں،
کوئی آواز نہیں، سات سال کی ازدواجی زندگی اسے ایک پتلا ٹکڑا مل جاتی تھی، اس مدت کا
خیال کرتا تھا تو اسے ایسا احساس ہوتا تھا جیسے ایک بہت بھاری مل اس کے سینے پر پڑ چکی
ہو جس سے اس کا سانس رکنے لگا ہے۔

وہ اپنی چارپائی پر بیٹھے، پرزے چھت کو گھورتا رہتا تھا۔ دیواروں کو گھورتا رہتا تھا۔ محلے کا کوئی سویا عودت آئی تو چند لمحوں کے حلق سے نیچے اتر جاتے ورنہ بھوکا پیاسا بیٹھا رہتا یا اٹھتا پڑوسی، دوست ملنے ملنے والے نسل دیتے اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا دل ٹھوتا چلا گیا بھی بھی آنکھیں اور بچھ گئیں۔

اتوار کے دن اس کا سر سخت اٹھ کر کے اسے اپنے گھر لے گیا اس کا ارادہ تھا کہ اسے چند روز اپنے یہاں ٹھہرانے لیکن فرزند ہوا ایک دن بھی وہاں نہ گزار سکا۔ شام ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ وہ بھاگا اپنے گھر کی طرف اور دروازے پر پہنچتے ہی جیسے کسی نے اس کے قدم روک لئے دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر اس کی ریڑھی کھڑی تھی جسے صفائی کی موت پر آلے دالوں نے کمرے میں بیٹھنے کی گنجائش نکالنے کے لئے باہر نکال دیا تھا۔

اُسے لگا جیسے ریڑھی خاموش زبان میں اسے بلا رہی ہے۔ اسے اپنے پاس آنے کے لئے کہہ رہی ہے۔

وہ آگے بڑھا اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اس کی ہاتھی پر رکھ دیئے ماس کا سر جھکے لگا۔ جھکا چلا گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ہاتھی کے نیچے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ یکایک دو ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حائل ہو گئے۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز میرے اللہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

اس کے سارے جسم میں ایک نرمی سی، ایک حرارت سی پھیلی چلی گئی، اس نے اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہاتھی سے لگا دیں جیسے آنکھوں سے اسے جرم دہا ہوا اس نے اس طرح ہاتھ بڑھا رکھے تھے جیسے ریڑھی کو اپنی گود میں لے چکا ہو۔ جیسے وہ ایک زندہ وجود ہو جس کے سانسوں میں اس کی نازید، اس کی صفائی کے سانسوں کی گرمی بھر گئی ہو اور یہ سانس اس کے چہرے کو اس کی دگ دگ کو چھو رہے ہوں۔

وہ سب سے بے خبر بنی کھڑا رہا۔ اسی حالت میں کھڑا رہا۔

ملے گزرتے گئے، اندھیرا بڑھتا گیا اور پھر محلے میں کوئی شخص بھی یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کب
 ریڑھی سے الگ ہو کر اندر گیا تھا مگر صبح کے وقت سب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ پہلے
 کی طرح ریڑھی کی رشتی تھاے اس راستے پر چلا جا رہا ہے جو سبزی منڈی کو جاتا ہے۔

عنایت بی بی کا افضال

یہ ایک عجیب القاب تھا کہ گلزار انصاری اور استاد فیروزہ دونوں ایک ہی نام کو ایک ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ انصاری صاحب شہر کے مشہور و معروف چھاپرخانہ انصاری پریس کے مالک تھے اور استاد فیروزہ جوان کے شاندار بچگلے کے قریب ہی رہتا تھا۔ انصاری پریس میں بلور سازی کا کام کرتا تھا۔

جس خاتم انصاری صاحب کے بچگلے میں ان کے پہلو بچی کے بچے نے پہلا سانس لیا ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ بچگلے کے درو دیوار رنگارنگ روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب گئے۔ رات کے دو تین بجے تک مبارک باد دینے والوں کا آنا تانا بندھا رہا۔ انصاری صاحب نے اپنے اہل ہراس ہنگامہ سترت کا اہتمام کیا جس پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ دوسری طرف استاد فیروزہ کے معمولی سے مکان میں یہ ہوا کہ آدھی رات تک روشنی رہی اور پہلیوں کی بیویوں استاد کی بیوی عنایت بی بی کے پاس آکر بچے کو دیکھ کر اور منہ میٹھا کر کے زچہ و بچہ کو ڈھیر ساری دعاؤں دے کر رخصت ہوتی رہیں۔

ڈیڑھ بجایا ہو گا جب عنایت بی بی نے سر سے پٹی اتاری اور اسے اپنے لگے کے بچے رکھ دیا اور جب سوتے ہوئے بچے پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ غور ہوا کہ صاحب صرف ایک ماں ہی کے لئے مخصوص ہے یہ جذبہ غور جیسے دل کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی دگ دگ میں سرایت کر گیا اور جب اس نے کھڑکی میں سے انصاری صاحب کی جگہ گاتی ہوئی کوٹھی کو دیکھا، تو اس کے باوجود کہ اس کی آنکھیں چند حیا گئیں، اس کے جذبے میں کوئی کمی نہ آئی۔

عنایت بی بی ہر روز کسی نہ کسی ہمسائی کی زبانی یہ خبر سن لیتی کہ کل انصاری صاحب نے اپنے دوستوں کی بڑی شاندار ضیافت کی ہے اور آج ان کے فلاں فلاں رشتے دار پہنچے کے لئے طوع طرح کے خوبصورت کپڑے لے کر آئے ہیں۔ ایک روز اس نے یہ بھی سنا کہ بچہ ابھی ایک ماہ کا بھی نہیں ہوا کہ برسی کے منجھرنے درمیان کھلنے اس کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ وہ ایسی خبریں سن کر صرف سکرام مچی، مگر اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ دل میں کہتی اور اپنے انضال کو بے اختیار سینے سے لگا کر بیچ لیتی اور اس کی پیشانی پر کئی برسے ثبت کر دیتی۔ کبھی اسے اپنی اس عروسی کا احساس ضرور ہوتا کہ نہ تو چمکے میں اس کا کوئی بزرگ ہے نہ سسرال میں۔ وہ ایک نیم لڑکی تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی۔ اس کے سسر اور اس کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

گھر کا کام کاج کرنے کے لئے اس نے اپنی چھوٹی بہن سکینہ کو اپنے یہاں بلوایا۔ سکینہ نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ وقت پر بچے کو بازاری دردھ بھی بلاتی۔ اس کے پڑے بھی صاف کرتی رہتی۔ کھانا دانا بھی تیار کر لیتی صبح سے لے کر شام تک گھر میں بیٹھے رہتا اس کے لئے نکلن نہیں تھا اور ہر کام سے فارغ ہوتی اور ادھر یہ جاوہ جا۔ کبھی بغیر عزت کے بازار میں کوئی چیز ضرور نہ مل جاتی اور کبھی یونہی کسی ہمسائے کے گھر میں پہنچ جاتی۔ اور قراور انصاری صاحب کی کوٹھی میں بھی گھنٹہ ٹڑیڑھ گھنٹہ گزار آتی۔

اس دور ہر کو عنایت بی بی کے انضال کی طبیعت قدرے ناما ز تھی۔ بہن سے کہا،

”سکینہ! انضال دو رہا ہے۔ گد میں اٹھا کر بھلا، چپ ہو جائے گا۔“

سکینہ نے بچے کو گد میں اٹھایا اور باہر دالان میں آگئی۔ کچھ دیر تو بچہ روتا رہا۔ پھر خاموش

ہو گیا۔ عنایت بی بی چار پلن پر بیٹھ کر اس کا نرنا سنی رہی۔

سکینہ اندھا گئی۔

”آپا! میری بائیس ٹوٹ گئی ہیں۔ اتنا بھاری ہے تیرا لال!“

عنایت بی بی کی پیشانی پر ناگہاری کے عالم میں ٹھکنیں پڑ گئیں۔ غوراً بولی :
 مریض دور۔ کالی زبان دلی۔

سکینہ منہ سہود کر بولی :

”اور کیا ہے ہاتھ دیکھا اور کہنے دلی تھی کہ بہن کے تھوڑے کچھ کر ڈر گئی اور بات پلٹا کر
 کہنے لگی :

”آپا ! ماشاء اللہ بڑا ہی پیارا ہے۔“ اور کھٹکھٹا کر جس پڑی۔

عنایت بی بی کی کاموڈ ذرا خراب ہو گیا تھا اس نے بہن کی گود سے اپنا بچہ لے لیا اور اسے
 چار پائی پر لٹا دیا۔

”آپا ! اس کے لئے پگھوڑا کیوں نہیں منگوا لیتیں ؟“

عنایت بی بی نے بات سمجھ کر بھی ایسا جبرہ بنایا جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی ہو۔

”پگھوڑا آپا ! پگھوڑا سونے میں بچہ لیتا ہے۔“

اس کی آپا انبات میں سر ملانے لگی۔

”آپا ! کیا بتاؤں۔ آج میں انصاری صاحب کے گھر گئی تھی۔ وہاں پگھوڑا پڑا تھا۔ اس نے آپا میں

کیا کہوں ! ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی دیکھا ہو گا۔ وہ جو اماں ہے ندا جی شریا کی ماس۔

وہ کہنے لگی۔ یہ پگھوڑا کسی باہر کے ملک سے آیا ہے۔“

عنایت بی بی نے منہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ ٹھٹھکی ہانڈھ کر بہن کا جبرہ دیکھتی رہی۔ یہ

بہ بلا موقع تھا کہ ایک خبر نے اس کے ذہن میں ایک ٹکیری ڈال دی تھی۔

شام کے وقت فیروز گھر آیا۔ اس وقت عنایت بی بی بچے کی آنکھوں میں کابل ڈال رہی

تھی اور وہ بڑی طرح جھٹکا رہا تھا۔ فیروز نے بچہ گود میں اٹھایا۔ بولا،

”بس بس۔ شہزادے لے چپ ہو جا۔“

عنایت بی بی نے خود ہر کر کنگھیوں سے دیکھا۔

”میں نے کہا جھوٹ ٹوٹ کا شہزادہ ہے نا؟“

”ہیکوں، جھوٹ ٹوٹ کا کیوں ہو گا؟ سچ بچ کا ہے!“

”جائے دو جی! جھوٹ نہ بولو، شہزادے کے لئے ایک پنگوڑا بھی نہیں لا سکتے۔ غلامت بلی نے شکایت کیا۔“

فرز نے پہلو میں کبوتری کو دیکھ کر غمزگوں کرتے ہوئے کبوتر کی طرح سینہ پھلاتے ہوئے اور
افضل کو ماں کی گود میں دیتے ہوئے کہا:

”پنگوڑا کیا میں تو اپنے شہزادے کے لئے تخت لے آؤں گا۔ دیکھو تو یہی؟“

یہ فقرہ سن کر غلامت بلی بی بی کے دل میں ایک مبہم سا خوف پیدا ہو گیا۔ شاید یہ خوف اس
وجہ سے تھا کہ کہیں اس کا شوہر آدمی تنخواہ خرچ کر کے پنگوڑا بھی نہ خرید لائے۔ احتیاط کہنے لگی:

”پنگوڑے بلال خلیج کی برائی دکانوں پر ملے ہیں۔“

فرز نے کچھ سوچتے ہوئے چکی بجا کر گریٹ کی راکھ جھاڑی سول کے مطابق دونوں ہونٹ
بند کر کے شوک نکلا اور سر ہلاتا کرے سے نکل گیا۔

”دسے روز پر میں سے واپس آیا تو یہ بوری نے پوچھا۔“

”اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”تم نے جو کہہ دیا تھا شہزاد کے لئے پنگوڑا لاؤ۔“

مکین نے جب یہ الفاظ سنے۔ اس وقت وہ نکلے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔ صاف اس
کے ہاتھوں کو لگا تھا۔ وہی حالت میں اٹھ کر آگئی۔ اُسے توقع تھی کہ پنگوڑا کرے کے اندر
ہو گا، مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

”پنگوڑا کہاں ہے بھائی جان! اس نے یہ دھرو دھرو نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔“

فرز نے دوسری مرتبہ شوک نکلا اور دائیں ہاتھ میں جو ایک پونگی کی پکڑے ہوئے تھا، اسے
کھول لے گا۔ وہ کھل گئی، تو چار پائی کے اوپر نصف درجن کے قریب پلاسٹک کے بنے ہوئے طرح

طرح کے کھلونے بکھرنے لگے۔ سیکین کی آنکھیں ایک طرز پر سکوڑھٹ سے چمکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ عنایت بی بی یا سیکین کچھ کہے فیروز بولا:

”پرانا پنگوڑا بھی پیس سے کم میں تھا۔“

”پھر یہ کیا اٹھا لانے پر عنایت بی بی کے لیے میں تلخی تھی۔“

”کھلونے میں کھلونے، مواجہ روپے طرح کئے ہیں؟ فیروز نے یہ الفاظ ایسے لیے جس میں کہے جو اس

کے اندرونی جذبہ تباہی کی غمازی کر رہا تھا۔

عنایت بی بی بچے کو چھوڑ کر چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گندے برتن اکٹھے کرنے لگی، مگر

سیکین کو صبر کیاں: کہنے لگی:

”بھائی جان! پنگوڑا لے آتے نہ؟“

”کس سے لے آتا؟“

”انصاری صاحب لائے ہیں نا؟“

فیروز نے سگریٹ کا لباکش لیا اور ایک لمحے کے لئے اپنی سلائی کی طرف اس انداز سے

دیکھا جیسے وہ اس کی دماغی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہنے لگا:

”سیکین: جانتی ہوا انصاری صاحب کی آمدنی کیا ہے؟ کل ہی ایک بینک سے بچاس ہزار

کا ٹھیکہ ہوا ہے۔ وہ تو وہ ہزار کا پنگوڑا بھی خرید سکتا ہے۔ ہم اس کی دس کر سکتے ہیں؟“

عنایت بی بی جس نے مارے برتن جمع کرنے تھے اور اب اٹھا کر باہر لے جانے والی

تھی اپنے اندر غم و غصے کی ایک شدید لہر سے بے تاب ہو گئی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اس کیفیت

کا اظہار کر کے اپنی گھٹن تو دہر کرنا تھی، بولی:

”سیکین! گھر کا کام نظر نہیں آتا؟“

سیکین کی نظر سب سے لگے انہوں پر بڑی توجہ سے مارا گیا کہ کھڑے کے اوپر بہت سارے کپڑے

اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کمرے میں اب فیروز تنہا افضال کے

پاس رہ گیا۔ اس نے کھلوے اٹھنے کئے اور یہ کہتے ہوئے بچے کے چہرے کے پاس رکھ دینے والے شہزادے پیش کر آیا۔

سکینہ بی بی کو جو دروازے کے پاس کھڑی تھی اس منظر کو دیکھتے ہی نہ جانے کیا ہوا کہ وہ چپٹے کے بنو سے اپنی آنکھیں پر پونچھنے لگی۔

ماہ رمضان کا آغاز ہوا، اس کے ساتھ ہی عید کا حضور ہنوں میں ٹپل چمانے لگا۔ عمارت بلند نے پہلے ہی دن روزے کی افطاری سے پہلے اپنے شوہر سے کہہ دیا،
”کچھ تلبے؟“

فیروز کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بیوی کی ان الفاظ سے کیا مراد تھی، مگر وہ انجان بن کر پوچھنے لگا:

”پتا کس کا؟“

”بڑے بھولے بنتے ہو۔ عید نہیں آ رہی؟“

فیروز نے حسب معمول دانتوں کو زور سے بند کر کے تھک لنگلا اور آہستگی سے کہا:

”عید تو ہر سال آتی ہے، اس برس بھی آجائے گی۔“

اور اس سے پیشتر کونسلگو میں کسی قسم کی ملالگری پیدا ہو وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”افطاری یونس کے اہل ہو گی۔ یونس اس کے ساتھ چھاپے خانے میں مشین مین تھا۔“

ایسے سرے پر سکینہ کے لئے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس وقت بیمار جیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی نکل آیا تھا۔

”آپا! پتا ہے وہاں کتنے جوڑے آپکے ہیں؟“

وہاں سے اس کی مراد انصاری صاحب کا بنگلہ ہوتا تھا۔

عمارت بی بی کو بہن کی یہ مداخلت پسند نہ تھی، لیکن وہ خاموش رہتی اور اس کی باتیں سنی تھیں۔

”آپا! خدا جھوٹ نہ بلائے، دوسرے کس بھر گئے ہیں اس کے کپڑوں سے اور ابھی نہ جانے

کہنے اور جوڑے گھر میں آئیں گے۔ آپا!

عنایت بی بی نے جبرے پر نظر ڈالی۔ ایک اندرونی اضطراب اور غمٹش سے اس کے جبرے پر تشنگی کے اثرات پھیل گئے۔

”ہمارا افضال، انصاری صاحب کے شاہد میسا نہیں؟“

سکینہ نے یہ سوال پوچھ کر اپنی ذہنی کشمکش سے نجات پائی، مگر بہن کو ایک شخص بھی درود کیا۔ مطلب ہے تیرا؟ عنایت بی بی نے یہ سوال اس انداز سے پوچھا جیسے اس میں اس کا اپنا ارادہ شامل نہیں ہے۔

”آپا! ہمارا افضال، شاہد میسا ہی تو ہے، بلکہ اس کا رنگ اُس سے گورا ہے؟“

عنایت بی بی نے اپنا اترتھ غصے سے ہلادیا۔ سکینہ آنکھیں ملتی ہوئی برے جا رہی تھی

اس بات اس نے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے سوچا: آخر میرے بچے اور ان کے بچے میں

فرق کیا ہے؟ فرق یہی ہے، مگر وہ انصاری صاحب کا بچہ ہے جو پیرس کا مالک ہے اور ہمارا بچہ استاد خیروز کا بیٹا ہے جو ایک جلد ساز ہے۔ پس اور فرق کیا ہے؟

صبح اٹھ کر جب وہ ضرور کو کام پر بھیج رہی تھی، اُس نے تاکید کی: ”

کوئی اور کام کرو۔ ڈھیر ہلے پیسے لاؤ افضال کے لئے کپڑے خریدنے ہیں۔“

خیروز نے اس کے جواب میں صرف ایک لمحے کے لئے رجوع کر دیکھا اور اپنی پرانی سائیکل

صحن سے باہر نکالنے لگا۔

عید کی آمد میں تین روز باقی تھے۔ سکینہ ہر تیسرے چوتھے روز انصاری صاحب کے منگے

جو کرائی — اور واپس گھر آکر بہن کو بتاتی:

”آپا! آج شاہد کا داماد بہت ساری چیزیں لے کر آیا تھا آج اس کی ماں خوش چنگ کے

لئے اندر لگی تھی اور شاہد کے لئے بڑے سی خوب صورت کپڑے خریدا رہی تھی۔“

عنایت بی بی کے دل سے ایک دھواں سا اٹھتا اور اس کی آنکھوں کے دانتے آنسوؤں

میں منتقل ہو کر بہہ جاتا۔

اس شام فیروز ایک گھڑی میں اٹھائے گھر میں آیا۔

”لو، لے آیا ہوں۔۔۔۔۔“ اور گھڑی ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے بولا۔

عناست بی بی نے جو ہانڈی میں دھنی پھیر رہی تھی، جلدی سے دوپٹے سے ہاتھ پونچھا اور سوہم کے پاس آگھڑی ہوئی۔

فیروز چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ سیکن بھی کوئی کام بیچ میں چھوڑ کر نونا آگئی۔

”جہاں جان کیا لائے ہیں؟“ افضال کے لیے کہنے سے اس نے بے تابانہ سے پوچھا۔

فیروز نے گھڑی کھولی اور اس میں سے کیا نکالا: دو شوئیں اور دو ٹیکریں۔ دونوں بہت سولہ لگتا تھا۔ چیزیں کسی ریزرچی والے سے بہت کم قیمت پر خریدی گئی ہیں۔

باہری سے دونوں ہنسلہ کے جہرے ٹھک گئے۔

فیروز نے ان کی اس کیفیت کو نورا بھانپ لیا۔ غصے کی ایک تیز تندہ اس کے دل سے اٹھی۔ مگر جب تک اسے یہی خیال آگیا کہ آخر وہ اپنے بچے کے لئے لایا کیا ہے، اور غصے کی ہلر اس کے جہرے پر آخر تار نہ ہو سکی، دو تین غلوں کے لئے اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہوئی اور پھر ٹپک پڑ گئی۔

عناست بی بی اپنی جگہ پر ٹھکی ٹھکی سی تھی اور فیروز اپنی جگہ پر سیکن کی زبان و تنہا فرقتا چلی رہتی تھی۔ وہ اپنی آپا کے ذہن میں یہ نہیں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ افضال کے آبا کو اپنے بیٹے کا کچھ زیادہ خیال نہیں ہے، ایسے موٹے رت و خرب سے غریب باپ لگا اور حار لے کر اپنے بچے کے لئے قیمتی کپڑے خریدا ہے، وہ کیوں نہیں جواہریتے۔

عید آگئی۔ فیروز کے گھر میں بھی عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ رونق محسوس ہوئی تھی۔ فیروز عید

کے لئے ضروری چیزیں لاچکا تھا۔ باورچی خانے میں سوتیاں بھی مینوں میں داخل جا رہی تھیں اور

پلاؤ کی پختی کے لئے کچھ گوشت بھی اڑائی میں رک دیا تھا۔ تاہم ایک انسولی تھی جو سب کی

آنکھوں میں بار بار جھٹک اٹھتی اور ایک بزدلی کا احساس تھا جو انہیں میں مصروفیت کے عالم میں بھی کام کرنے سے روک دیتا اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگتے۔

غایت بی بی باورچی خانے سے باہر آئی، تو اس نے دیکھا کہ انضال کا باب برجے کے لئے یمن دروازہ پشتر پکڑے لایا تھا، وہ ایک بیڑھی کے اوپر پڑے ہیں، چار دیوے پر انضال بھی دکھائی نہیں دیتا اور سیکھ بھی غائب ہے۔

اس نے خیال کیا کہ وہ بچے کو کپڑے پہنا رہی ہوگی، کیونکہ اس قسم کے کام اسی کے سرزد تھے۔ مگر وہ بچے کو پہنا گیا رہی ہے۔ اس کے لئے کپڑے تو بیڑھی کے اوپر بکھرے ہوئے ہیں۔

— سیکھ! اس نے آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا اس نے دوسری طرف پکارا دوسرے کمرے سے سیکھ کی آواز آئی،

”جی آپا!“

”کیا کر رہی ہو؟“ بہن نے پوچھا۔ ”اند انضال کہاں ہے؟“

”کچھ کر رہی ہوں آپا۔ انضال میرے پاس ہے؟“

غایت بی بی نے جاہل کرے کے اندر جانے، لیکن جب اس نے دروازے میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا دروازہ اندر سے بند ہے۔

”یہ کیا مصیبت ہے؟“ غایت بی بی کو بڑا غصہ آیا، اس نے صرغ کر اس فحشے کا اظہار کیا،

”دروازہ کیوں بند ہے؟ یہ کیا ملے؟“ سیکھ کی بچی، ”دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟“

سیکھ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

غایت بی بی نے پہلے دروازے پر دستک دی، پھر اس پر زور زور سے ہاتھ مارے۔

”بھڑیل! تو اندر کر گیا رہی ہے؟ کھول دروازہ! کھولتی ہے یا...؟“ اس نے ایک خونخاک دھکی

دی۔ ”دروازہ توڑ دوں گی؟“

”کھولتی ہوں آپا! غصہ مارتا، میں ابھی کھول دیتی ہوں۔“

”میں پرچھتی ہوں اندر ہو کیا رہا ہے۔“ غریبہ تنگی سے عنایت بی بی کی آواز کانپ کر رہی تھی۔
کمرے کے اندر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ اور وہ لڑو کھل گیا۔

”آپا! اتھار اٹھنا۔ رکھو، آج ہے ناشہزادہ!“

عنایت بی بی نے سکینہ کی گڑبڑ انضال کو دیکھا جو پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔ نہایت خوبصورت
قیمتی اور رنگین لباس میں مبوس تھا۔

عنایت بی بی سراپا استعجاب بن گئی۔

”آپا! ہے نا چچ بچے کا شہزادہ!“

”پر۔“ عنایت بی بی اور کچھ نہ کہہ سکی۔

”اُدھر سے آئے ہیں۔“ انصاری صاحب کی بیگم نے ہمارے انضال کے لئے بھیجے ہیں۔ کتے

ایسے لوگ ہیں آپا!“

اور سکینہ نے انضال کا منہ چوم لیا۔

عنایت بی بی اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی۔

”لو آپا شہزادے کو!“

عنایت بی بی نے ہاتھ بڑھا دیئے۔ بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ گلتا تھا بچہ ابھی اس کی
گود سے پھسل پڑے گا۔ اس نے اسے مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ اسے تنگی بانہ کر
دیکھ رہی تھی اور اس کے ماننے سکینہ تا لیاں بجا بجا کر ناچ رہی تھی۔

”آپا! خوشنا اپنے شہزادے کو!“

عنایت بی بی نے بچے کو ذرا اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ اس کی پیشانی کو چھونے لگے، مگر
ایک لمٹ اس نے ہونٹ بچے کے ماتھے سے ہٹائے۔ اسے یکا یک ایک عجیب سا احساس
ہونے لگا۔

”یہ انضال۔ اس کا انضال نہیں۔ اس کا اپنا انضال نہیں۔ یہ بہت قیمتی پتھر ہے۔“

ہونے کون ہے؟ کیا میرا اپنا ہی انصال ہے؟ نہیں نہیں، یہ تو...

اس کے بازوؤں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

وہ بچے کو گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ کئی لمحے دیکھتی رہی پھر سیکنڈ سے بلند اور حکم آمیز بچے

میں بولی۔

”سیکنڈ؟ اتار دو یہ کپڑے، پہناؤ وہ کپڑے؟“ اس نے بیڑھی پر پڑے ہوئے کپڑوں کی

طرف اشارہ کیا۔

سیکنڈ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ اس نے بہن کی طرف دیکھا جو پوری سنجیدگی سے بچے کو

اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

درویش

وہ جب اس بستی میں داخل ہوا تو بھوک پیاس سے ٹھہال اور تھکاوٹ سے چوڑ چوڑ ہو چکا تھا۔ ایک قدم اٹھانا بھی اس کے لئے درمہم تھا۔ آج ہی وہ چار سال کی قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ گھر بار کوئی تھا نہیں اپنے تینوں دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اس کو بہتینوں درمست کہیں بھی نہیں ملے تھے۔ شاید قید کاٹ رہے تھے یا غصوں کر کے کہ شہر میں کافی بدنام ہو چکے ہیں۔ قسمت آزمائی کے لئے کہیں اور چلے گئے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ یہ بستی کا بیرونی اور قدرے غیر آباد حصہ تھا کیونکہ یہاں لوگ بہت کم آتے جاتے تھے۔ گھروں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں، دھواں نکل رہا تھا کسی گھر تک پہنچنا اس کے لئے ایک دشوار امر تھا وہ تو چاہتا تھا کہ وہیں زمین پر لیٹ جائے۔ بھوک پیاس کی شدت کا بھی خیال اس کے ذہن میں رہ چکا تھا اس نے ایک درخت کے تنے پر اپنا حایاں ہاتھ رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے لیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ چند گز کے فاصلے پر سے ایک عمارت کی دھندلی سی دیوار نظر آئی۔ وہ یہ سوچ کر اس کی طرف بڑھا کہ اس کے دروازے پر دھک دے گا۔ خود کو ایک تھکا مار مسافر بتائے گا۔ اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور رات گزارنے کے لئے تھوڑی سی جگہ کے لئے درخواست کرے گا۔ اس نے بار بار مٹا تھا کہ قصبوں اور بستیوں کے لوگ مسافروں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہیں اس لئے اس سے بھی اچھا سلوک کیا جائے گا

بڑی شکل سے اس نے چند قدم اٹھائے۔ وہاں بیٹھا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیوار تو

کھڑی ہے مگر اس میں دودھ کا کوئی نمونہ نہیں۔ دو دیواروں کے درمیان ایک عام دودھ دانے جتنا خلا ضرور تھا۔ جو شاید دودھ دانے کا کام دیتا ہو گا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آگے بڑھ جاتا کسی اور عمارت کے دودھ دانے پر جا کر دستک دیتا مگر اس وقت تو وہ اس قدر خستہ حال ہو چکا تھا کہ آگے چلنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔

وہ اندر چلا گیا۔ زمین پر دو ختوں کے ڈھیروں پتے پڑے تھے کئی درخت اس عمارت کے ارد گرد کھڑے تھے۔ تیز ہواؤں سے انہی کے پتے دہاں جا گئے تھے۔ یہ کافی کٹناہ جگہ تھی۔ اس سے ملحق جو جگہ تھی وہ ذرا اونچی تھی اور اس کے اوپر چھت پڑ چکی تھی۔

یہ غیر مکمل عمارت کی ہے۔ اسے اس حالت میں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس کے دماغ میں ایک سوال ابھرا لیکن اس پر غور کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی وہ چھت کے نیچے لیٹ گیا۔ ابھی چھت پوری نہیں پڑی تھی۔ آخری کڑی اور دیوار کے درمیان کم از کم ایک گز کا نا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس خالی جگہ میں سے نویں یا دسویں کے چاند کی روشنی بھیجیں کرانڈ آ رہی تھی۔ موسم گرمیوں کے اختتام اور سردیوں کے آغاز کا تھا۔ آدھی بیفر چاند یا کبیل کے بھی سو سکتا تھا۔

پیشے کو تو وہ لیٹ گیا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اسے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ لیٹے گا گہری نیند سو جائے گا لیکن اتنی تھکاوٹ کے باوجود وہ کدھ پر کدھ بدل رہا تھا اور آنکھیں بدستور کھلی تھیں۔

ایسی حالت میں انسان لامحالہ کچھ سوچنے لگتا ہے۔ خاص کر اپنی زندگی کے گزرنے ہوئے واقعات اور وہ بھی ماضی کے دھندھکوں میں ڈوبے اپنے اس زمانے میں چلا گیا جب وہ امرتسر کے ایک محلہ بازار بکر داناں میں پاؤں پاؤں چلا تھا۔ باب ایک سولہ دو کا نڈار تھا۔ جو کچھ کانا تھا۔ اس سے گھر کی بنیادی ضرورتیں ہی پوری ہوتی تھی۔ نصیراں باب کا اکوٹا بیٹا تھا اس سولے نازد ختم میں پرورش پا رہا تھا۔ ابھی اس کی عمر پانچ سال کی ہوئی تھی کہ پاکستان قائم ہو گیا۔ اس کے ماں باب نہ جانے کتنے خطروں سے گزر کر اسے لاہور کے بھائی دودھ دانے کے اندر لے آئے

جہاں ان کا ایک دستہ وار پچھلے چالیس برس سے مقیم تھا۔ اس درشتہ دار نے انہیں رہنے کے لئے اپنے وسیع مکان کے پچھلے دو کمرے دے دیئے۔ انہیں مہاراول مل گیا تھا لیکن گھر کا خرچ چلانے کے لئے تو انہیں خود ہی انتظام کرنا تھا۔ نصیر کا باپ صرف دوکانداری جانتا تھا۔ لیکن یہاں اسے کوئی دکان نہ مل سکی ناچار ایک مدرس میں ملازم ہو گیا۔

افرنغری کا زمانہ تھا۔ کسی کو کسی کی پردا نہیں تھی۔ نصیر کا باپ صبح جاتا تھا اور سونچ لٹا واپس آتا تھا۔ آتے ہی کچھ کھاپی کر سوجاتا تھا اور صبح تک اسے کچھ جوش نہیں رہتا تھا۔ نصیر جب امرتسر میں تھا تو کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ لاہور آیا تو اگرچہ اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ کسی مدرسے میں داخل ہو جائے لیکن اسکے باپ کی ساری سرگرمیاں صرف دولی پڑا ہوا کپڑے تک محدود ہو چکی تھیں اس لئے نصیر کو محلے میں سارا دن کھیلنے کی آزادی تھی۔ باپ آتا تھا تو اسے مکان سے پکڑ کر گھر کے اندر لے آتا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے کپڑے گرد آلود اور لم تھیں اور چہرے پر مٹی کی تھیں۔ جم پوچھی ہوتی تھیں۔

کھیل کا جسکا نصیر کو اس قدر لگ چکا تھا کہ وہ گھر میں لگتا ہی نہیں تھا۔ اور باپ پریس گیا اور ادھر وہ بھاگا بھاگا باہر پہنچ گیا۔

ایک سال یونہی بیت گیا۔ پچھلے سال میں اس کے باپ نے لارہٹ کر اسے ایک قریبی مدرسے میں داخل کرا دیا۔ کچھ روز تو وہ بستہ تھا کہ اتنا مددہ کلاس میں جاتا رہا۔ پھر وہی کچھ ہونے لگا جو پہلے ہوتا رہا تھا۔ اور سچی چٹھی کے وقت وہ اپنے خاص دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتا تھا اور شام کے قریب واپس آتا تھا۔

اس طرح ایک اور سال ضائع ہو گیا۔ اس کی ماں نے اسے مسجد کے مولوی کے سپرد کر دیا۔ وہاں بھی اس کا یہی طریقہ ملا۔ ناچار باپ نے اسے مولویوں کی ایک درکشاپ میں کام کیے کے لئے درکشاپ کے بڑے مستری کے حوالے کر کے سمجھ لیا کہ چلو چار بیٹے کی آمدنی ہو جانے پر گھر کا خرچ چلانے میں تدریس سہولت نکل آئے گی۔

دو سال تک اس کی توقع پوری ہوئی وہی نصیر سسڑی سے تیس روپے لاکر اس کے
 دھنوں میں دبتا رہا۔ پھر ایک دن صبح ہی صبح سسڑی نے اس کے گھر آکر آواز دی نصیر کا
 باپ باہر آیا۔

”کیوں خبر تو ہے سسڑی جی؟“

”اس خبر ہے صدودینا! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے نصیر کو سمجھاؤ۔“

”کیوں کیا ہوا ہے؟“

”ہونا کیا تھا چور اچکوں کی ایک پارٹی بنی ہوئی ہے سرخاڑ اس پارٹی کا لیڈر ہے
 چند روز ہوئے سرخاڑ تمہارے بیٹے سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ مجھے اسی وقت تک پڑ گیا
 تھا برسوں سے وہ کتاب سے بہیز پاٹ گم ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ سمجھ لیا؟“
 یہ بات صدودین کی سمجھ میں نہ آئی سو والدہ نظروں سے سسڑی کو دیکھنے لگا۔ سسڑی کی
 پیشانی پر ہلکی پڑ گئی اور وہ غصے سے لولا۔

”صدودینا! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ سرخاڑ نائی گرائی گرہ لگت چور ہے وہ بے وقوف
 لوگوں کو اتوٹا کر ان کے ذریعے دکنشایوں سے پرزے حاصل کرتا ہے اور بازار میں جا کر
 بیچ دیتا ہے۔ یہ بھی اس کا دھنڈا ہے۔“

”تو میرے نصیر نے کیا کیا ہے؟“

”سسڑی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ گرج کر کہنے لگا۔

”تمہارے نصیر نے یہ کیا ہے کہ عارف دکنشاپ سے پرزے چرا کر اسے دیتا رہتا ہے
 اب تو صاف صاف سن لیا نا۔ صدودینا۔“

پھر سسڑی کا لب و لہجہ غلام ہو گیا۔ تم ایک شریف آدمی ہو۔ اس لئے تمہارے بیٹے کے
 کے کنو قوں سے تمہیں واقف کر دیا ہے۔ اسے سمجھا اور نہ نتیجہ بہت برا ہو گا۔“

یہ کہہ کر سسڑی چلا گیا۔ صدودین نے یہ سارا قصہ اپنی بیوی کو بھی بتا دیا وہ لمبائی میں

دوبلی بھیر دی تھی۔ یہ بات سن کر اس کا ہاتھ وہیں اُک گیا اور چہرہ پیلا پڑ گیا کافی دیر کے بعد اس کے منہ سے حرف بہ الفاظ نکلے نہ نصیر دین کے آباؤ اجداد نصیر ایسا نہیں ہو سکتا؟ صدیق نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ چہرے کے پاس پیڑھی کے اوپر چٹھا گھر کر آتے ہوئے سیاہ بالوں کو گھورتا رہا۔

نصیر دین آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹھالی کی ٹوکری تھی جو اس نے ماں کے آگے دکھادی اور اس موقع کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ ابھی اُٹھ کر اسے پیٹنے سے لگے گی اور اس کا ہاتھ جوم کر ڈھیر ساری دعائیں دے گی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے یا کوئی حرکت کرے۔ اس کا باپ گر جا۔

نصیر کے یہ پیسے کہاں سے لائے تھے؟

سزئی نے دیئے تھے۔

آج نو پندرہ مارچ ہے۔ پیسے کی تھکواہ پندرہ کو رکھ لی گئی؟

نہیں چاہا! یہ تھکواہ کے پیسے نہیں ہیں۔ سزئی نے یہ کام پر خوش ہو کر دیئے ہیں۔

فصیحے سے نصیر دین کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ وہ بڑھئی سے اٹھ بیٹھا۔ پورے نو پندرہ کے کال پر تھیرتا رہا۔

اسرا سزا سے جھوٹ بولتا ہے۔ درکشاپ کے پرزے جو مار بھ مارش گرد کٹ سرسزا کو دیتا ہے۔ نصیر تھیر نکلا کر دیوڑھی سے جا لکھ لیا۔ نصیر دین نے چٹا اٹھایا لیکن اس کی بیوی نے چٹے دھلا ہاتھ پکڑ لیا۔ نصیر دین دونوں کو گلابیوں پر گالیاں دینا رہا۔ آخر چٹا اس نے بیوی کے ماتھے میں دے دیا۔ دیکھو زہرا! اسے کہہ دو آئندہ اس نے ایسی حرکت کی اور سرسزا سے بار بار نہ لکھا تو میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ اٹھ جا۔ کبے دیتا ہوں۔

وہ باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زہرا نے دو ساری رو دو ساری جس نے نصیر دین کے اندر خفیہ کی آگ بھڑکادی تھی۔ اس نے بیٹے کا چہرہ دھلایا۔ اس کے بالوں

میں مادرِ رازِ خفیت سے اپنی انگلیاں پھیریں اور بڑے دیار سے اسے کھجاتے ہوئے کہا: نصیر
 میرے عمل و فکروں نے کہا ہے کہ بڑوں کی صحبت میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ تو ہی خود بڑا ہو جاتا ہے
 تجھے کیا پڑی ہے کہ اس بد معاش سرفراز سے یاری کرے۔ نہ پورا نہ ہم شریف لوگ ہیں میرے
 ساتھ کچھ ایسا دیا ہو گیا تو ہم کسی کو مدد کھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اللہ عزت کی راہ
 روٹی دیتا ہے۔ میرے شکر کر کے کھا لیتے ہیں:

ماں کے یہ الفاظ سن کر نصیر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر ایک وقتی کیفیت تھی
 ایک ہفتے بعد ہی نصیر کو مارپیٹ کر درگاہ سے نکال دیا گیا۔ باپ اسے اپنے ساتھ پریس
 لے جانے لگا پریس کے کام میں نصیر کامل نہیں لگتا تھا۔ باپ کے ساتھ تو چلا جاتا مگر جب
 کاریگروں کو کھانا کھانے کی چھٹی ملتی وہ چپ چاپ پریس کے چورہ دروازے سے نکل کر سیدھا
 سرفراز کے ہاں چلا جاتا۔

سرفراز نے جسے وہ استاد کہہ کر پکارتا تھا اسے اپنے کتبہ کھانے شروع کر دیے تھے۔ اور
 جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی وہ اپنے فن میں بھی ہوشیار ہوتا چلا جاتا تھا۔ مگر اس نے
 ابھی تک چھوٹی چھوٹی داد و تحسین کی تھیں۔ کوئی بڑا سرکاری ادارہ تھا۔

ماں اسے دو دو کر کھاتی رہتی تھی۔ باپ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ بیٹے کی
 طرف سے بالکل ایس ہو گیا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کا بیٹا کب گھر میں آئے
 اور کب باہر نکل جاتا ہے۔ اور لوں وقت گزرتا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں نصیر نے بڑی کا درد لائی کی اور رنگے ہاتھوں پکڑا لیا، جیب تراشی کے
 جرم میں اسے اڑھائی سال کی سزا ہو گئی۔

ماں نے خبر سنی تو اس پر بھی گر پڑی۔ باپ کو معلوم ہوا تو وہ۔ بوی سے مخاطب ہو کر بولا
 میں پہلے ہی جانتا تھا، یہ ہو گا۔ مجھے تو بتا رہا تھا کہ:

”کیسے کچھ لوں ماں نے سینے پر دو ہتھ بارتے ہوئے کہا۔ خدا کے واسطے کچھ کرو:

میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے بھی اندر کرانا چاہی ہی ہو؟

وہ جیل میں آخری سال کی سزا کاٹ رہا تھا کہ ایک عزیز نے آکر خبر پوچھائی کہ تیری ماں مر گئی ہے۔

یہ خبر سن کر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور وہ ساری رات سو نہ سکا۔ سزا کاٹ کر وہ گھر آیا تو باپ نے کہا: کیا کرنے آئے ہو۔ تجھے سینے سے لگانے والی ماں مر گئی ہے۔ دفعہ دہرہ ہوا تو میری نظروں سے۔ میرا بڑے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے: وہ لٹے پاؤں گھر سے نکل آیا۔

اس گھر کے سوا اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور یہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا سٹی گیٹ میں سرفراز کے پاس جا پہنچا۔ سرفراز نے اس کی پوری داستان سنی تو کہنے لگا: یاد اس میں گھبرانے کی بھلا کیا بات ہے۔ میرے پاس ایک کمرہ تو ہے نا دونوں مزے سے رہیں گے۔ ابھی رقم کہیں سے ملے آجائے گی تو اپنا مکان خریدیں گے۔ دونوں کوشش کرتے ہیں۔ اللہ رازقی ہے۔

سرفراز نے بزرگوں کی طرح اس کی پیٹھ پر چھکی دی۔ بازار سے نان کیا بے لے آیا اور دونوں کھا کر سو گئے۔

اس کی بہم جاری رہی مگر کبھی سود بیہ ملے آجائے۔ کبھی تین چار سو۔ یہی حالت سرفراز کی بھی تھی۔ اس طرح سات برس گزر گئے۔

ایک بار اس نے بس میں بڑھیا لباس میں ملبوس ایک بڑی بڑی موٹھیل والے فریبانڈام شخص کو دیکھا۔ کچھ لپٹا اس کی جیب میں بہت کچھ ہو گا۔ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ ایسے لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ سارا دیر ایک ہی جیب میں نہیں رکھتے۔ کئی جیبوں میں رکھتے ہیں۔ بس میں اتنا جھوم تھا کہ کل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے سہری موقع تھا۔ جب وہ بڑی موٹھیل والا بس سے نیچے اترنے لگا تو اس نے اس کی ایک جیب کی صفائی کر ڈالی۔ اور

بڑے سکون سے چلتا ہوا قریبی بانجھ میں چلا گیا۔ رقم گئی تو پانچ ہزار تھی۔ یہ کافی رقم تھی۔
وہ بڑے آرام سے سٹی گیٹ کی طرف جانے لگا۔

یونیک اس کی نگاہ پھر اسی آؤں پر رہا جی اب وہ دانا دربار کی جانب قدم بٹھارہا تھا۔ اس روز بڑا خوش تھا۔ لوگ حقوق و درجہ کی طرف جارہے تھے باؤٹ رہے تھے۔ وہ نہر کے کنارے کے پار سے چلا جا رہا تھا۔ اور اس شخص سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اس کی دوسری جیب میں مال ہو گا۔ اس نے سوچا کیوں نہ سو فیس سے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ ہلٹ کر تیز غیر قدم اٹھانے لگا۔ وہ شخص سبائی گیٹ سکول کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے ارد گرد بے شمار لوگ آ جا رہے تھے۔

وہ بھرپور نہ پڑا۔ مونچھوں والے نے اسے بڑی طرح جکڑ لیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ ہزار غائب تھے۔ یہ اس کی جیب میں سے نکل آئے۔ اب کیا تھا۔ کوئی صورت بچاؤ کی نہیں تھی۔ حوالات میں پہنچا اور حوالات سے چار سال کے لئے جیل میں اور آج شام وہ جیل میں پوری سزا کاٹنے کے بعد رہا ہوا تھا۔

اس وقت آس پاس کوئی بھی نہیں تھا وہ تھا اور وہ وہ پران جگہ۔ اس نے اپنی بیٹھ دیوار کے ساتھ لگا دی اور آہستہ آہستہ پاؤں پھیلانے لگا۔ پاؤں پیلا چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بھوکا اور پیاسا ہے غیر ارادی طور پر اس کا لم تھا ایک جیب کے اندر چلا گیا۔ کچھ نقدی تھی جو وہ جیل کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہرنائڈ منٹ جیل کے پاس رکھوا گیا تھا اور یہ وہی رقم تھی۔ اس سے کچھ دن پیٹ بھر سکتا ہے۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا اور وہ ٹہلت سے باہر آ گیا۔

بازار میں گھومتے گھومتے اس کی نظر ایک خورد پر پڑی جس کے ارد گرد لوگ بیٹھے تھے۔ وہ اسی طرح پیٹ بھرنے کا عادی تھا۔ مرزا کے لہاں اسے بارہا اس طرح پیٹ بھرنے پڑا تھا وہ خورد کے پاس با بیٹھا تو خورد والی نے اسے بڑے خور سے دیکھا اس کی نگاہیں غریب

اغلاں میں کہہ رہی تھیں کہ تجھے اس سے پہلے یہاں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ کہاں سے آ گیا ہے۔
اس نے نمود والی کی نظروں کا منہم سمجھ دیا مگر اس طرح جھکا یا جیسے وہ اس سوال کو
کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

ہیٹ بھرنے کے بعد وہ واپس اسی جگہ آ گیا۔ اب وہ یٹا تو نیند کا غبار اس کی آنکھوں
پر چھا گیا۔ ابھی وہ گہری نیند سو رہی رہا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کے قریب آگ جلتی
ہوئی ٹھوس کی گھبراہٹ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سورج اوپر چمک رہا تھا اور اس کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔
اس نے دیکھا کہ کئی لڑکے اس کے پاس کھڑے ہیں اور ایک لڑکا دوسرے سے کہہ رہا
ہے۔ یہ مسیت کا موٹی ہے۔

مسیت کا لفظ سننے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”موٹی جی! تم یہاں رہو گے؟ ایک لڑکے نے پوچھا۔

نصیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم لڑکوں کو پڑھاؤ گے؟ دوسرے نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور طرح طرح کے سوالوں سے اسے پریشان کر رہے
تھے۔ یکایک وہ سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ایک بوڑھا شخص جس نے نیلے رنگ کے
دھسے کی ٹیکل ماہر رکھی تھی۔ لٹکا کر لڑکوں سے کہنے لگا۔

”او فیضانو! کیا جمع لگا رکھا ہے مسجد کے اندر؟

ایک لڑکے نے اس کی طرف رخ کیا حاجی جی ایہ پتہ نہیں کرنا ہے مسیت میں

آ بیٹھا ہے۔

وہ شخص جسے لڑکے نے حاجی جی کہا تھا نصیر پر قہقہے لگا دیں اور اسے ہٹا دیا اور اس

کے قریب آکر رک گیا۔

”کون ہو تم جہاں؟ کہاں سے آئے ہو۔ میری مسجد میں کیوں آ بیٹھے ہو؟ حاجی جی نے ایک ہی سانس میں تین سوال جڑ دیئے۔

جب وہ بچہ تھا تو اس نے اپنے باپ سے ایک کہانی سنی تھی جس میں ایک جن انسان کا دوپ دھار کر ایک مسجد میں تدویش بن کر بیٹھ جاتا ہے اور کئی سال مودی سے سبق پڑھتا ہے اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔
”میں تدویش ہوں؟“

”تدویش ہو تو تدویشوں والے کام کرو، اس طرح نکلے کیوں بیٹھے ہو؟ حاجی صاحب نے کھیل کا سرا لہرایا اور دروازے سے نکل گئے۔ لڑکے بھی چلے گئے۔ فیصہ نے اپنے دل سے سوال کیا میں اب کام کیا کروں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دیواروں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ زمین پر کوڑا کرکٹ کے انبار لگے تھے۔ وہ مسجد سے باہر آیا۔ ایک دوکان سے جھاڑو خریدا اور مسجد کے اندر آکر تھماڑو دینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کے قریب لڑکے اسے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ وہ ہر کے وقت اسے بھوک لگی تو تنور پر آ گیا۔ بیٹ بھر کر روٹی کھاتی اور پھر وہیں اپنی جگہ پر جا کر بیٹ گیا۔ آنگھ اس وقت کھلی جب شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔

”مسجد میں تو روشنی بھی ہونی چاہیئے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ جس دوکان سے تھماڑو خریدا تھا دہان سے تین موم بتیاں اور ایک ماہ جس خریدا کر لے آیا۔ مسجد کے صحن میں ایک جگہ ڈہلی اینٹوں کا ڈھیر بڑا تھا۔ فیصہ نے دیوار کے ساتھ ایک گزنیک دو دو اینٹیں کھڑی کر دیں اور ان کے اوپر ایک ایک موم بتی جلا دی۔

موم بتی کی یہ روشنی اس فضا میں عجیب سا منظر پیدا کر رہی تھی۔ یہ منظر دھندلا دھندلا سا اجنبی اجنبی سا اور بھیا بھیا سا۔ وہ ایک موم بتی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور موم بتی کی لوکر

دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد یہ روشنی اسے بڑی پیاری لگی۔ جیل کی راتیں اندھیری ہوتی تھیں۔ چار سال تک مسلسل اندھیروں میں سانس لینے کے بعد اسے یہ پہلی روشنی نظر آئی تھی۔ جو اس کے میں سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ اور جسے اس نے خود روشن کیا تھا۔

وہ دواہد اینٹیں لے آیا اور ان کے اوپر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک بند رکھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ فضا میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دوڑوں موم بتیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے عیسوی بھی جلا دی۔ اوجھی رات نہیں گزری ہوگی کہ تینوں موم بتیاں جل چکی تھیں۔

”یہ ٹھیک نہیں۔ میں لمپ لاؤں گا۔“

اور صبح سویرے جیسے ہی دوکان کھلی وہ لمپ لے آیا اور موم بتی کی جگہ اینٹوں کے اوپر رکھ دیے۔ یاد ساری مسجد میں بھاڑ دی اور ادھر ادھر جو اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے انہیں باہر پھینک دیا۔ اس کام میں وہ اس طرح مصروف رہا کہ دوپہر کے وقت تنور پر جاکر روٹی بھی نہ کھا سکا۔ اور جب دو بجے تنور پر پہنچا تو دماں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ واپس آکر پھر کام میں لگ گیا۔

پانچ روز بیت گئے تھے۔ چھ روز حاجی صاحب اپنے نیلے کپڑے کی لٹکل مارے آ گئے۔

”لگتا ہے تیار ہو گیا کوئی نہیں؟“

”کوئی نہیں۔“

”مسجد کی خدمت کر دے؟“

”جی۔“

حاجی صاحب ایک منٹ خاموش رہے۔ پھر لمبے۔

”اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہو؟“

اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے مشکل تھا۔ تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔
”کچھ نہیں؟“

”یعنی سدی عرقم نے کچھ نہیں کیا؟“

وہ خاموش رہا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”نصیر“

”اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ ماں مر گئی تھی۔ باپ نے گھر سے نکال دیا ہے۔“

”کیوں نکال دیا ہے؟“

حاجی صاحب اب کے دو منٹ تک بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔
”دیکھو نصیر! میرا نام حاجی الدین ہے۔ وہ جو کہار کی دکان ہے نا اس کے سامنے“

میری حویلی ہے۔ پیلے رنگ کی میں نے تنہا اس مسجد کو بنوایا ہے۔ پیسے ختم ہو گئے تو یہ
نامکمل رہ گئی۔ میرا ایک چھوٹا مکان بھی ہے۔ اسے بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک گیارہ
تو اسے کھل کر دوں گا۔ تم یہاں بوری طرح درویش بن جانا۔ تنور پر بیٹھ کر روٹی مت کھایا کرو۔
دو پیر اور شام کو روٹی میرے یہاں سے لے کر دو من لیا ہے نا۔ میری حویلی وہ سامنے ہے
کہار کی دکان کے سامنے پیلے رنگ کی۔“

”اب حاجی“

اسے حاجی صاحب کے گھر سے روٹی ملنے لگی۔ تاہم اس نے خود بھی مٹی کا ایک پیالہ،
ایک حلال اور پانی پینے کے لئے شیشے کا ایک معمولی گلاس خرید لیا۔ کبھی کبھی دیر ہو جاتی تھی تو
وہ حاجی صاحب کے گھر نہیں جاتا تھا۔ تنور سے دو روٹیاں پیسلے میں وال لے لیتا تھا اور
آتے ہوئے بیرونیل کٹی کے گل سے اپنا گلاس بھی پانی سے بھر لیتا تھا۔ اپنی جگہ پر روٹی کھانے

لگتا تھا تو اسے عجیب قسم کی راحت ملتی تھی۔ ایک دو بہرہ روٹی سے پیٹ بھر رہا تھا تو ایک چڑیا اوپر درخت کی کسی شاخ سے اڑ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”جھوک گئی ہے بھاری کتو اور اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا الگ کیا اور اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے چڑیا کے آگے پھینک دیا۔ اسنے میں اور چڑیاں بھی آگئیں۔ وہ حاجی صاحب کے گھر سے اپنی روٹی لاتا تھا تو نور سے ایک خاتون روٹی بھی خرید لیتا تھا۔ یہ روٹی چڑیوں کے لئے ہوتی تھی۔ چڑیوں کو بیٹ بھرے دیکھ کر اسے ناقابل فہم خوشی ہوتی تھی۔ چڑیاں اس کے آتے ہی نیچے آ جاتی تھیں۔

وہ ایک دو بہار لے آیا اس میں وہ چڑیوں کے لئے پانی لے آتا تھا۔ اس کام میں اس کا دل بہل گیا تھا اور وقت کا کچھ حصہ بڑی خوشگوار کیفیت میں بسر ہو جاتا تھا۔ حاجی صاحب دوسرے تیسرے دن آ کر یہ خبر سنا دیتے تھے۔

بات چل رہی ہے۔ اچھے پیسے مل جائیں تو چھوٹا مکان بیچ دوں۔ اسنے پیسے تو ہوں نا ڈیڑھ ٹا کہ مسجد مکمل ہو جائے؟

”حاجی صاحب! اس نیک کام میں دوسرے لوگ شامل نہیں ہو سکتے؟ ایک روز نصیر نے پوچھ لیا۔

”واہ دردیش! کیسی بات کہتا ہے۔ ساری بستی میں مشہور ہے کہ یہ مسجد ہاں اور ہاں کی ہے۔ میں نہیں خرچ کروں گا تو نور کوئی کرے گا؟ دردیش! اللہ سے دعا کرو مکان جلدی یک جا جائے۔ اللہ کے گھر کو اس حالت میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے؟ حاجی صاحب بولے۔ اور پھر کئی ہفتے خاموشی سے بیٹ گئے۔

نصیر مسجد کے کاموں میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور حاجی صاحب اس کے سامنے اور اس کی عدم موجودگی میں لوگوں سے کہتے رہتے تھے۔

”دیکھو ایسا ہوتا ہے دردیش؟

حاجی صاحب اس سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ اس سے کئی بار کہہ چکے تھے: ”مردیش! تمہارے لئے یہاں ایک بہت شاندار حجرہ بنے گا جس میں تم بڑے آرام سے رہنا اور مسجد کی خدمت کرنا۔ تمہاری شادی بھی کر دی جائے گی۔“ اور وہ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے یہ خوشخبری سناتے بڑے مزے سے رہو گئے۔ کسی شے کی کمی نہیں ہوگی آج سے تمہارے خیمے پانی کا بھی انتظام کر دیا ہے جو بھی اللہ کے گھر کی خدمت کرتا ہے اسے اللہ بہت کچھ دیتا ہے کچھ لیتا ہے۔ انہی دنوں حاجی صاحب کا مکان مغول رقم پر رک گیا اور مسجد کی تعمیر ہونے لگی۔

حاجی صاحب نے نصیر کے بہنوئی کے ساتھ ساتھ اختیارات کر دیئے تھے وہی بازار سے عزت کی چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ کاریگروں اور مزدوروں کا حساب کتاب رکھتا تھا اور ان کاموں کے لئے ہر وقت اس کے پاس خالص روپیہ جمع رہتا تھا۔

چار دنوں میں سلاطین بادشاہ ہونی تو نصیر کا کام رک گیا۔ پانچویں روز بادشاہ ختم گئی بھار اور مزدور آگئے: سینٹ ریت اور گھڑی۔ یہ چیزیں قریب قریب ختم ہو گئی تھیں اور چار بجے جب سب لوگ چھٹی کر کے گھر لوں کو جانے لگے نصیر نے سب سمجھا کر جن اشیاء میں کسی داغ نہ ہو گئی ہے وہ بازار سے خرید لئے اور وہ تانگہ کرا کر رستی سے نکل پڑا۔ پھر اگر سینٹ کی بھاریاں اس نے ریڑھے پہلو کر ادھر بھیج دیں اور خود گھڑی خریدنے کے لئے ٹمبر ایکٹ کی طرف جانے لگا۔

وادی دہڑ پر اس کا تانگہ جا رہا تھا کہ اس کی نظر دائیں طرف رہاغ کے کنارے جنگل کے سامنے ایک فیکری پر پڑی جو فٹ پاتھر پر نیم دراز تھا اور اس کا باغ تھ گدائی کے لئے پھیلا ہوا تھا۔ ایک بلی سی اس کے ذہن میں گونڈ گئی: کیا یہ —؟

اس نے تانگہ رکوا دیا۔ نیچے اتر اور جنگل کی طرف چل پڑا۔

اس کی نظروں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے سرفراز ہی تھا۔

”استاد! تم — نصیر نے اس پر جھک کر کہہ

”کون ہو؟“ سرزاز نے پھیلا ہوا ہاتھ بے انتیادی کے عالم میں کھینچ لیا۔

”استاد! نصیر کے ہونٹوں سے یہ لفظ اہل پڑا۔“

”کون ہو؟“ سرزاز نے اسے پہچان لینے کے باوجود استفسار کیا۔

”میں نصیر ہوں استاد!“

”نصیر! اتنا مر گیا ہے۔ یہ اس کی لاش ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ جاؤ۔ چلے جاؤ۔“

”نہیں۔ نہیں استاد! میں تمہیں کیسے چھوڑ سکنا ہوں۔ بتاؤ یہ کیا ہو گیا۔ کیسے ہو گیا۔ تم

سرکاروں پر۔“ استاد! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ خدا را بتاؤ۔“ سرزاز نے اپنا سر دونوں ذائقوں میں چھپایا

”استاد! استاد بتاؤ۔ نصیر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔“

”ذائقو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ بیمار لوں نے کیس کا نہیں رکھا۔ تباہ ہو گیا ہوں۔“

”موت نہیں آئی۔ بے شری سے جی رہا ہوں۔“ سرزاز نے اسی حالت میں یہ لفظ کہہ کر مراد

چھپا لیا۔

”استاد! چلو گھر چلیں۔“

”کس کے گھر۔ کیسا گھر؟“

”تباہ گھر۔ سٹی گیٹ داے گھر۔“

سرزاز دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”نصیر! میں کرایہ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے۔“ انک نے مجھے نکال دیا۔ گھر میں جو

کچھ تھا۔ چھین لیا۔ کچھ نہیں رہا۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا۔“

سرزاز کا بدن بڑی طرح لرز رہا تھا۔

نصیر کا اپنا سر جھک گیا۔ تاہم والایہ منظر بڑی محنت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تانگے سے اتر کر

ان کے پاس ہی آ گیا تھا۔

”استاد! میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں لے جاؤ گے؟“

”جہاں مجھے پناہ ملی ہے۔“

نصیر نے کچھ ان کی حد سے سرخاڑ کو اٹھا کر تلنگے پر بیٹھا اور تلنگے یعنی کی طرف جانے لگا۔ حاجی صاحب اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے جب تلنگہ دہاڑہ پہنچا تو وہ تلنگے میں ایک اپاہج آدمی کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ نصیر نے سرخاڑ کو تلنگے سے اٹا کر دروازے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف لے آیا۔

”یہ کون ہے درویش؟ وہ کون ہے؟“

”میرا پرانا دوست۔“

”اُسے کیوں لے آئے ہو؟“

نصیر ایک منٹ خاموش رہا اور مسجد پر نظر میں جانے کھڑا رہا۔

”حاجی صاحب! میں نے سوچا تھا۔ اللہ کے گھر میں مجھے پناہ ملی ہے تو اُسے بھی مل جائے گی۔ نصیرؐ پر فخر کہ رہا تھا اور حاجی صاحب کا ایک عقیدت مند ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا جسے سن کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہ تہارا پرانا دوست ہے۔ چور، اچکا، نامی گرامی گرہ کٹ۔ کسے یہاں لے آئے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو درویش!“

نصیر سرخاڑ کو سہارا دیئے کھڑا تھا اور برجہ سے اس کا جسم جھکا ہوا تھا۔

حاجی صاحب! میں بھی اسی کا ساتھی تھا۔ میں بھی مری کچھ تھا۔ حاجی صاحب! حاجی صاحب کی مونچھوں کے بال خدیہ غصے میں پھر دبھڑانے لگے۔

”تم اس کے ساتھی تھے۔ تم بھی۔ بد معاش، پاہی، میں نے تمہیں دعویش سمجھا تھا۔“

”تم۔ دفع ہو جاؤ۔ تہاڑے لئے بھی یہاں کوئی جگہ نہیں۔ دفع دور ہو جاؤ۔“

حاجی صاحب کی گرجتی ہونے آواز فضا میں اس طرح گونجی کہ کوئی گھروں کی کھڑکیاں

کھل گئیں۔

”ٹھیک ہے حاجی صاحب۔“

نصیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا ہنڈل نکال کر حاجی صاحب کی طرف بڑھادیا۔

”آپ کی امانت؟ اور یہ کہہ کر اس نے سرفراز کو اپنے ہانڈوں پر اٹھالیا۔

”چلو استاد! ایک میرا گھر بھی ہے۔ شاید وہاں پناہ مل جائے۔ نہ لی تو سزا دیں۔

باغ ہیں۔ گھنیرے درخت ہیں۔ ان کے ساروں میں جی لیں گے۔“ تھوڑی دیر بعد رات

کے اندھیرے میں ایک تانگہ مٹی ریس سے نکل رہا تھا۔

کاغذ کی ناؤ

اس سال کی یہ تیسری تقریب تھی جو راشد کے گھر میں ہو رہی تھی۔ پہلی تقریب فردی کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی اور یہ ایک مجلس مولود تھی۔ دوسری تقریب ایک سالگرہ تھی، راشد کی پہانچی کی جو چند روز کے لئے اس گھر میں آگئی تھی اور اتفاق یہ کہ چودہ جولائی کو اس کی سالگرہ کا دن تھا جب وہ وہیں مقیم تھی تو رچی کی نانی اس موقع کو کیسے ضائع کر سکتی تھی انہوں نے شاہدہ کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی اور بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور اس روز اس کے اپنے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ دن ساٹھس نمبر کا تھا اور راشد کی امی بہنتوں سے اس کی تیاری کر رہی تھیں۔ محلے کے اندر اور محلے کے قرب و جوار میں جتنے بھی بڑے گھر تھے وہاں جا جا کر وہ گھر والوں کو بالخصوص لڑکیوں کو سالگرہ میں شرکت کی دعوت دے آئی تھیں اور انہیں موقع تھی کہ اس مرتبہ وہ اس مقصد میں مزدور کا سیاب ہو جائیں گی جو ہر تقریب کے برپا کرنے میں ان کے پیش نظر رہتا تھا۔

تقریب رات کے نو بجے تک جاری رہی۔ بڑی رونق رہی، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راشد کی امی نے جن جن لڑکیوں کو مدعو کیا تھا وہ سب کی سب آگئی تھیں۔

راشد جب تھک تھکا کر اپنی خراب نگاہ کی طرف جا رہا تھا تو اس کی امی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور اپنے قریب آنے کے لئے کہا۔ راشد جاتا تھا کہ وہ کیا پرہیزیں گی، اس لئے وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ چھوڑو نا امی! ہر بار کیا قصہ لے بیٹھتی ہیں آپ بہت اچھی تقریب ہوئی بہت خوبصورت تھنے لے اور کیا چاہیے؟

مگر راشد کی امی کو نہ تو ساگرہ کے شاندار ہونے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ خوبصورت
 شخصوں سے کوئی سروکار۔ وہ تو یہ سلوم کرنا چاہتی تھیں کہ اس کے ضدی بیٹے کو کوئی لڑکی
 بھی پسند آئی یا نہیں۔ تین سال سے وہ ایک ہی رٹ لگاتے جا رہا تھا: امی! جب تک مجھے
 کوئی لڑکی پسند نہیں آئے گی میں شادی کے معاملے میں ہاں نہیں کہوں گا۔ اور اس کی امی کسی
 نہ کسی بہانے سے درجنوں کے حساب سے لڑکیاں اسے دکھا چکی تھیں مگر کسی موقع پر بھی "ہاں"
 اس کے ہر تھوڑے سے نہیں نکلی تھی۔

اس کی بیوہ ماں اپنی بڑی لڑکی کی شادی کر چکی تھیں۔ لڑکی تو بھرتی ہی ہے کسی بزرگے
 گھر کی امانت۔ وہ چلی گئی تو ماں کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے بیٹے کا گھر آباد
 ہو اور وہ برابر تین برس سے اسی گھر و دو میں مصروف تھیں لیکن ان کی ہر کوشش ابھی تک
 ناکام ثابت ہوئی تھی۔

”راشد جیٹا! کچھ بولو تو، راشد کی امی کا بھو بہت حد تک متقیانہ تھا اور راشد اس کو سمجھتا
 تھا لیکن یہاں جواب دینے سے خود کو قاصر محسوس کرتا تھا۔ جس سے ماں کو تسلی ہو۔
 ”ٹھیک ہے امی! ٹھیک ہے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنی اتنی کو وہ عام طور پر
 اسی طرح نالاکرتا تھا۔

”کچھ کہو تو: امی! کچھ کہلو! بے برسر تھیں۔ انہوں نے کتنا وقت صرف کر کے بکنی کوشش
 کر کے انہی ساری لڑکیوں کو جمع کر لیا تھا۔ ان میں سے تین چار تو ہر لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔
 حسین و جمیل، تعلیم یافتہ اور معزز خاندانوں کی ہشتم و چارٹھ، لیکن ان کے بیٹے کی ضد اپنی بلکرتا نام تھی۔
 ”امی! نکرہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آرام کیجئے، بہت شک گئی ہیں آپ۔ یہ
 کہہ کر راشد نے بچھا چھڑایا اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑا۔ نیند اس پر غلبہ پالے لگی۔
 یکایک ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرا نے لگا۔ زین عذاب کے بھی اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ
 نہیں لائی تھی۔ کیا وجہ ہے اس کی؟

فصیحہ کو اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ان کے ہاں آئی تھی۔ بڑی شوخ گفتار لڑکی تھی۔ ایک منٹ بھی خاموشی نہیں بیٹھتی تھی۔ دانش کا ہر طرح مذاق اڑایا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ اس سے کئی بار ملا اور ہر بار اس نے غصے سے کہا کہ فصیحہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ ایک مرتبہ اسے کانٹے کے دانے میں بھی دیکھا تھا۔ کوئی غلطی نہ تھی جس میں وہ بھی شامل ہوتی تھی اور اپنی سحر یانی سے اس نے سارے ساتھیوں پر جادو کر دیا تھا۔ پھر وہ اس کو کہیں بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی بڑی بہن ہر تقریب میں شریک ہوتی تھیں وہ نہ آئی۔

”وہ کیوں نہیں آئی تھیں ہے اس کی شادی ہو چکی ہو اور وہ کہیں بیرون ملک چلی گئی ہو“ اس نے سوچا۔ اور ارادہ کر لیا کہ صبح جب امی سے ملے گا تو ان سے فصیحہ کے نہ آنے کا سبب ضرور دریافت کرے گا۔

نورجے اسے اپنے بگس پر پہنچا جانا تھا جہاں وہ اسسٹنٹ منیجر تھا۔ پورے نو بجے تک اسے یاد ہی نہ رہا کہ رات اس نے امی سے کیا سوال پوچھنے کے بارے میں سوچا تھا۔ جب وہ بالکل تیار ہو کر گھر سے باہر قدم رکھنے والا تھا تو اسے اپنے سوال کا خیال آ گیا۔ اس کی انہی ناشتے کے گندے برتن اٹھا کر نلی کی طرف لے جا رہی تھیں۔

”امی! اس نے مددگارے کے ہاں جا کر اپنی امی کو مخاطب کیا۔ امی دک گئیں۔

”رضیعہ کی چھوٹی بہن فصیحہ بھی تھی نا۔“ وہ نہیں نظر آئی کیوں؟ اس نے سوال کیا۔

”کیسے؟“ اس نے امی سے جواب دیا اور جس انداز سے دیا اس سے واضح طور پر غصے سے ہوتا تھا کہ انہیں اس موضوع سے کوئی توجہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر کہ دانش مزید سوال کرتا تو دھوپی سے نکلنے والے بگس جو دراصل بگس کے پیرے لے کر آیا تھا اور انہیں کرسی کے اوپر رکھنے ہی والا تھا۔

مانند چاہتا تھا کہ امی خدا فارغ ہوں تو فیصحو کے نہ آنے کی اصل وجہ پوچھے مگر وہ تو ایک ایک کپڑے کا جائزہ لے رہی تھیں اور راشد کو اندیشہ تھا کہ وہ اس کام میں کئی منٹ غور صرف کر دیں گی اس لئے وہ بگ بگ دھانڈ ہو گیا۔

بگ میں بہت معذرت دہی تھی، تاہم جب بھی اسے فرصت کے چند لمے میسر آتے تھے، وہ فیصحو کے بارے میں خود سے ایک آدھ سوال پوچھ لیتا تھا۔ شلا کیا وہ شادی کے بعد کسی باہر چلی گئی ہے یا وہ چلا تو نہیں ہے۔ ماں کے اس جواب نے کیسے آنکھیں میسے کچھ مضطرب کر دیا تھا اور وہ صورت حال جلد سے جلد معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پیشی کے وقت اسے یاد آیا کہ وہ چلنے کی ایک دعوت میں مدعو ہے۔ اگر اسے وہاں نہ جانا پڑتا تو وہ لازماً فیصحو کے دل جاننا، اگر اتنی مدت بعد جانا اور میسر کسی مقصد کے جانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

دعوت میں خاما دعوت گزر گیا، جب نوکر میز پر سے چلنے کے برتن اٹھانے لگا تو اس نے دوبارہ ہلکے ہونے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے نو بج چکے تھے۔

”اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اس نے سوچا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ امی نے اسے دیکھتے ہی کہا: گرم گرم کر دوں کھانا“

”نہیں امی وہاں بہت کچھ کھا لیا تھا۔“

ماں کا موڑ بگڑا ہوا محسوس ہوتا تھا اور وہ اس بگڑے ہوئے موڑ کی وجہ خوب جانتا تھا اس نے دوسرے پیسے بھی ماں کو بائیں کیا تھا۔ اور اس بار بھی اس نے انہیں محرومی کا ہی احساس دلایا تھا۔

وہ میز پر سے کھانے کے برتن اٹھانے لگی تھیں کہ راشد نے پوچھا۔

”امی! اب کون سی تقریب ہو گی؟ بات پر چھتے ہی وہ مسکرایا تاکہ ماں یہ احساس کر لے کہ وہ شرارتیسا سوال کر رہا ہے، سنجیدگی سے نہیں بلکہ ماں نے سنجیدگی ہی سے جواب دیا۔

تم سوچو :

”یہ کام تو آپ کیا کرتی ہیں امی؟ وہ سکوائے جا رہا تھا۔

ماں دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولیں : ”میں ہار چکی۔ تم جانو اور تمہارا کام : امی نے یہ الفاظ کہہ کر پلٹ کر بیٹے کو دیکھا جس کے چہرے سے سکراہٹ کی دھوپ غائب ہو چکی تھی راشد نے چاہا کہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ کہنے لگا۔

”امی آپ نے غصوں کیا کر رفیقہ کتنی پیغورہ تھی۔ اس کی بہن نصیرہ ایسی نہیں تھی آپ کو معلوم ہے نا کتنی خریدیں۔ ماں کے چہرے پر ہیزاری کے اخراجات چھانگنے اور وہ کچھ کہے بغیر بارہائی ٹانگی کی طرف چلنے لگیں۔

راشد نے لباس تبدیل کیا اور ہنگ پر لیٹ گیا۔

امی نے اس موضوع پر کچھ کہا ہی نہیں۔ معاملہ کیا ہے، جو کتنا ہے وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتی ہوں۔ نگاہیت مذہب کی وجہ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔

وہ یاد آ کر ایک مرتبہ دونوں نے مل کر کاغذ کی ایک کشتی بنائی تھی اور محلے کے اس نشیبی حصے میں جہاں دو روز تک لگا جا رہا تھا کی وجہ سے دو تین دن گھر پانی جمع ہو گیا تھا اپنی کشتی بہا دی تھی جب کشتی دور چلی گئی تو راشد نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اس کشتی میں کشتی کے اندر پانی چلا گیا اور وہ نیچے چلی گئی۔ وہ خرابانی سے باہر آ گیا۔

مذہبانے کیا بات تھی کہ اس وقت راشد کو نصیرہ کا چہرہ نگین نظر آیا۔

ایسی ضرور لڑکی یوں نگین بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے ان لمحوں میں سوچا تھا اور اس وقت بھی کہ اس واقعے کو گزیرے سا لہا سال بیت چکے تھے یہی سوال اس کے ذہن میں ابھر آیا تھا۔ ناشتے پر ماں سے چند عام سی باتیں ہوئیں۔ انہیں اپنی ناکامی کا احساس تھا یا بیٹے کی ضد نے اس پر وہ کر دیا تھا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

اتر کادون تھا اور یہ عام تعطیل کا دن تھا۔ وہ ماں سے کچھ کہے بغیر باہر آ گیا۔

اتھے دوسروں کے بعد رفیعہ کے ہاں جاتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ ہاتھ جیسے وہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جس کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ جس زمانے میں رفیعہ اور فیصلہ ان کے ہاں آیا جایا کرتی تھیں، وہ چار پانچ ماہ یں صرف ایک بار ان کے گھر میں جاتا تھا اور وہ بھی کسی تقریب میں مدعو کرنے کی خاطر۔ ان کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لئے۔ اور اب تو اسے کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیا ان کے گھر والے اسے اپنے ہاں دیکھ کر حیران نہیں ہو جائیں گے اور گز زبان سے کچھ نہ کہیں، ان کے دلوں میں تو یہ سوال خود سراٹھائے گا کہ آخر وہ ان کے ہاں کرنے کیا آیا ہے۔

اس کے قدم رفیعہ کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے اور ذہن میں ایک ایسی کشمکش برپا تھی جو براہر بڑھتی جا رہی تھی۔

مکان ڈھونڈنے میں راشدہ کو خاصی دقت ہوئی، لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح موہنی روڈ کے اس حصے میں بھی بے تحاشا مکان نہیں بچکے تھے جہاں ایک گھر میں اسے جانا تھا۔ رفیعہ کے باجی تحصیلدار رہ چکے تھے، اور گردان کے نام کی شہرت تھی اس لئے وہ جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

مکان پرانا نظر آ رہا تھا، دروازے کا رنگ دروغن اثر پرکا تھا، دروازے کے ایک طرف نام کی تختی پر فضل حسین تحصیلدار کے بٹے سے حرف بشکل بڑھے جاسکتے تھے، راشدہ نے کال بیل پر انگلی رکھنے سے پیشتر دو تین لمحوں کے لئے ہر طرف دیکھا، گھبراہٹ کی ضرورت سمجھ کر روانہ کرنے والا ہے۔

گھنٹی بجنے کے ایک دو منٹ بعد دروازے کے پچھلے سے رفیعہ کی ماں کی آواز آئی کہ کون ہے؟

”جی میں ہوں راشدہ، خیر جان!“

دروازہ فوراً کھل گیا۔

”اے راشدہ! کچھ بچے تم ہو یا؟“

”آپ یہ بیان نہیں کیسے خالہ جان

کمال کرتے ہو۔ اپنے راشدہ کہ نہیں یہ بیانوں کی آؤتا باہر و روانے پر کیوں کھڑے ہوئے

رفیعہ نے سکو اکس کا استقبال کیا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

ہو ایہ خالہ جان کہ میں ادھر اپنے ایک دوست کے ہاں آتا تھا۔ وہاں پر آپ کے مکان پر

بھی نظر پڑ گئی: اس نے یہ بات ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت سوچ لی تھی۔

رفیعہ کا چہرہ بھائی بھی آگیا۔ بوڑھا باب بھی میز پر چائے کے برتن بھی ترتیب دیئے جانے

لگے مگر اس سستی کی اس نے ابھی تک ایک جھک بھی نہیں دیکھی تھی جس کی خاطر وہ وہاں پہنچا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ رفیعہ اور اس کی ماں، دونوں نے اس سے پوچھا: اب شادی کب

ہو رہی ہے؟

اس کے جواب میں وہ فقط سکوا دیا۔

جتنی رسمی باتیں تھیں سب فوراً ختم ہو چکی تھیں۔ اب اسے چلا جانا چاہیئے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا

خالہ جان! اس کے لیے میں جھجک گیا ہوں تھی۔

”وہ۔ ہاں خالہ جان، نصیحوں دکھائی نہیں دی: اس نے پوچھا۔

رفیعہ کی ماں نے ایک لمبی آہ بھری: کیا دیکھ کر کہہ دے بیٹا:

”کیوں۔ کیا بات ہے؟ راشدہ نے پوچھا۔ مگر اسے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ محن میں آیا۔ ایک کونے میں کرسی کے اوپر ہاتھوں کے درمیان

کوئی اخبار پھیلا ہوا تھا جس کے پچھلے صفحہ کوئی چہرہ چھپ گیا تھا۔

”نصیحوں مٹی! راشدہ آیا ہے:

ماں کے یہ الفاظ سن کر رفیعہ نے اخبار پھاڑ دیا۔ اب راشدہ اپنے سامنے، حضور سے غافلے

پر اس چہرے کو دیکھ رہا تھا جو کم از کم بارہ برس بعد اسے دکھائی دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے

اس چہرے پر سکوا ہٹ آئی۔ دائیں ہاتھ سے اس نے سلام کیا اور پھر بائیں ہاتھ کی انگوٹھی اس پر چھائی۔

”راشد! ایکٹنٹ میں ایک گھاڑی نے میری بچی کی ٹانگیں پکڑ دیں۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی: گھر سے نکلتا شکل ہو گیا۔ کہیں آئی جانی نہیں میری بچی۔ راشد نے اب دیکھا کہ فیصلہ دہیل جہیز پر بیٹھی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی بے جان دکھائی دے رہی تھیں۔

”کیا یہ وہی شریر فیصلہ ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی چپ نہیں ہوتی تھی۔ اور اب کتنی خاموشی! افسردہ، ہزموں والا ہے۔ راشد نے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا اور اس وقت بھی یہی احساس اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا جب کھانا کھانے کے بعد تازہ اخبار کی نمایاں سرخیوں پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈال رہا تھا۔ اس کی امی اس کی طرف اس موقع سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ کچھ کہے گا۔ کچھ پوچھے گا۔ کسی اہم واقعے کا ذکر کرے گا لیکن وہ خاموش بیٹھا۔ انہوں نے اخبار کا لگایا کہ راشد کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہے اس لئے اپنی کرسی سے اٹھنے لگیں۔ اخبار کا ایک ورق میز کے اوپر الگ پڑا تھا۔ انہوں نے یہ ورق اٹھایا اور اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے آئیں۔ راشد دُعا: آج کل ضرورت دشتہ دسے اشتہار زیادہ چھپنے لگے ہیں۔

راشد کے چہرے پر ایک ہلکی سی سکاہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے میں غائب ہو گئی۔
”تم فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ ماں نے پوچھا۔

راشد خوب جانتا تھا کہ ماں کا اشارہ کس فیصلے کی طرف ہے مگر اس نے انہماں بن کر پرچھا: کس بات کا فیصلہ؟

”تم نہیں جانتے، چھاری ماں تم سے کس بات کا فیصلہ چاہتی ہے۔ آج تبدیلی بہن آئی کہ کہتی تھی بھائی جان! ماں شول کیوں کر رہے ہیں؟
”دیکھہ کر تو اور کچھ سوچتا ہی نہیں امی۔

راشد نے اپنی طرف سے اس موضوع پر مزید گفتگو کا اندازہ بند کر دیا اور وہ اخبار کھد کر کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ماں بولیں۔

”ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم سے عمر میں صرف دو سال بڑی ہے اس کی شادی ہو چکی ہے
 دو بچوں کی ماں بھی بن گئی ہے اور ایک تم ہو کر :

راشدہ جانے لگا۔ ہو جائے گا امی! ہو جائے گا۔ آپ کی ہونے والی بہو کیس بھانگی نہیں جانی
 یہ الفاظ کہہ کر وہ دروازے پر پہنچ گیا۔

”تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“ انہوں نے بیٹے کو روکے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”ابھی لوٹ آتا ہوں۔“

وہ غم دیکھتے کاشانی نہیں تھا مگر اس رات اس نے دوسرا خود دیکھا اور دیر سے گھر پہنچا اور
 جب بستر پر لیٹا تو ایک باد پھردی اندر وہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا جسے اس نے
 چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔

”اس نے صرف سلام کیا تھا اور وہ بھی صرف ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا نہیں تھا۔ ایک
 لفظ تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا۔ ایک ایکسٹرنٹ میں گاڑی نے میری پی کی ٹانگیں
 کھل دیں؟“ فیصہ کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ غامی ویر کے بعد اس کی آنکھوں
 میں آنسو آ چکی اور سونے سے چند لمحے پہلے وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔

”علی الصبح امی نے ناشتا لگایا تو بولا : ”امی آپ میرا فیصلہ سنا پا رہی تھیں نا۔“
 امی جو زانی اندے کی پلیٹ بیٹے کی طرف بڑھا رہی تھیں، سانس روک کر اسے دیکھنے لگیں۔
 نہیں نے فیصلہ کر لیا ہے امی؟“

”اللہ تیرا شکر ہے۔ بتا دو نا۔“

”امی! میں فیصہ سے شادی کروں گا۔“

ماں کی یہ کیفیت ہوئی جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ جب ان کی حالت کچھ

سنبھلی تو انہوں نے پوچھا : ”بیٹا راشدہ! تم نے کیا کہا ہے؟“

بیٹا جانتا تھا کہ اس نے جوابات کہی ہے وہ ماں نے پوری طرح کھلی ہے اور امی بھی جانتی

خبریں کہ بیٹے کو اس کا علم ہے۔

ای۔ امی! میری خوشی اسی میں ہے۔

بیٹا! تم کیا کہہ رہے ہو۔

مادہ ناشتا کرنے لگا۔ ماں اسے ٹھٹھکی بانٹھ کر دیکھ رہی تھی۔

ای۔ امی! نصیحو بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو مسئلہ کہہنا بہت اچ۔ اچ۔ چ۔ چھی۔ امی!

تم سچ کہہ رہے ہو؟ اسی طرح دیکھ رہی تھیں۔

میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ امی۔

نہیں! مادہ بیٹا تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ امی نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ

دیا۔ وہ اسکا ہاتھ سے دیکھ رہی تھیں جیسے جو کچھ اس نے کہا ہے وہ اس کا فیصلہ نہیں ہے۔ وہ ایسا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔

ای۔ آپ غائب کبھتی ہیں کہ میں نے کمینگی سے یہ الفاظ نہیں کہے حالانکہ پردی بھینگی سے

کہے ہیں۔ دیکھیے امی! اگر آپ کو اپنی ہوس کا انتخاب خود کرنا ہوتا تو آپ کو اس فرد کی کیا ضرورت

تھی۔ آپ کیوں تقریریں کرتیں۔ کیوں اتنی دیر تک انتظار کرتی رہتیں۔ فیصلہ صرف آپ کو کرنا

ہوتا تو میں کوئی اعتراض نہ کرتا مگر یہ حق آپ نے مجھے دے دیا۔ میری خوشی کا خیال رکھا۔ کیوں امی!

میں صحیح کہہ رہا ہوں؟

اس کی امی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

تو نصیحو آپ کی بہو بیٹے گی۔

مگر بیٹا! وہ تو۔۔۔

ای۔ اس کی مانگیں بے کار ہو گئی ہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ۔ صرف مانگیں ہی بے کار

ہوتی ہیں۔ زندگی تو بے کار نہیں ہوتی۔ امی! انداز سوچیے تو اتفاقات پر کسی کو کیا اختیار ہو سکتا ہے؟

امی خاموش رہیں۔ رانٹے ٹھوس کر لیا کہ وہ اب اس مسئلے پر کچھ کہنا سنا نہیں چاہتیں۔

وہ کسی ہر میٹھ گینس اور راشد باہر نکل آیا۔

اسی شام وہ درخت کے گھر میں کافی پانی پلا تھا اور بار بار اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے مجھے فیصو اپنی کمی سبیل سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ راشد نے دیکھ لیا کہ اس کی سہیلی کمرے کے دروازے سے نکلے ہوئے بیڑیڑ پہنچ رہی ہے۔ اس نے پیالہ ہاتھ میں پکڑے رکھی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

”آپ کب آئے؟“

”بندہ میں منٹ ہوئے ہیں۔“

فیصو نے استفسار طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔“

راشد نے درجن گھونٹ پانی کریالی میز کے اوپر رکھ دی۔ فیصو نے اپنی آنکھیں جبکالی تھیں۔

”فیصو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ آپ میرا ساتھ دیں گی؟“

فیصو کی نظر میں اوپر اٹھیں اور راشد جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

آٹھ روز کے بعد فیصو دہن بن کر راشد کے گھر میں آگئی۔ سب رسوم بڑی سادگی سے ادا کی گئیں۔ فقط بہت قریبی عزیز غریب میں شامل ہوئے۔ بہنوں کو اس واقعے کا علم ہی نہ ہو سکا۔ راشد کی ای بظاہر کچھ کچھ سی نظر آتی تھیں۔ تاہم ان کا دور یہ ایسا تھا جس سے بہو کے ساتھ کسی بڑائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں اور ان کی کوشش بہ بہت سی تھی کہ فیصو کو کوئی وقت اور تکلیف نہ ہو۔

راشد ماں کے اس رویے پر مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر اس کی ای تعلقاً خوش نہیں ہیں مگر وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ گھر کے ماحول میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

فصیحہ شرمائی شرمائی سی رہا کرتی تھی۔ راشد بھٹتا تھا کہ اس کا اس طرح خرابا کوئی ننانا
 موقع چیز نہیں ہے۔ ہر وہی سسلا میں شرمایا ہی کرتی ہے وہ اسے لطیفے سنا کر ہنسانے کی
 کوشش کرتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اس کے قریب رہتا تھا۔ سات دن چھٹی کے گزر گئے تو اس نے چپا
 یہ حمل بنایا کہ بگ سے یہ جاگھرا آتا اور کوئی نہ کوئی چیز سٹھائی یا پھلے کر آتا۔

وہ سینے بہت گئے۔ فصیحہ کا وہی انداز رہا۔ وہی جھکی جھکی نظریں وہی کم گوئی اور وہی
 سرد تفریح سے دھیمی نہ لینے کا اظہار۔

ایک دن موسم بڑا سہانا تھا۔ چار بجے چائے پینے کے بعد راشد کی اس تو گھر کے انتظام
 میں مصروف ہو گئیں اور راشد نے فصیحہ سے کہا: دیکھتی ہو موسم۔ ہے نا پڑ لطف۔ کیا خیال ہے
 باہر گھر سے چلیں؟

فصیحہ چند لمے قریب رہی پھر کہنے لگی: جی چاہتا ہے تو پہلے جائیں۔
 تمہارے بیڑا؟

اس میں حرج ہی کیا ہے۔

بہت حرج ہے فصیحہ۔ تمہارے بیڑے کا خاک لطف آئے گا؟
 فصیحہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔

کیا تم پہلے اس حالت میں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔
 فصیحہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

دہلی چیز بڑی آسانی سے ٹیکسی میں رکھی جاسکتی ہے۔ تمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔
 راشد اسے جناح باغ لے گیا۔ اسے ٹیکسی سے اتارا اور دہلی چیز ایک طرف لے
 جانے لگا۔

بڑا لطف آ رہا ہے۔ جب میں پڑھا تو اتنے ایک بہت خوبصورت بچہ گاڑی میں
 بیٹے کہیں باہر سے منگوا دی تھی ایک ملازم مجھے اس گاڑی میں بٹھا کر باغوں میں گھمائی پھر تی تھی

اور آج۔ کیا سوچ رہی ہو نصیر؟

نصیر خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ ایک لرزشی خمی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چکوں پر سائے سے لرزتے ہوئے غصوں ہوتے تھے۔ راشد کے ہاتھ رک گئے اور وہ اس کے خاموش زرد، افسردہ چہرے کو دیکھنے جا رہا تھا۔

”نصیر بتاؤ تو یہ کہی سوچ ہے؟“

نصیر نے زبان سے کوئی لفظ اور کیا نگرانی میں سر ہلا دیا۔

راشد وریل چیر کو گلاب کے مرنے چوکوں سے بھرے ہوئے ایک پارے کے قریب لے گیا۔ نصیر اب پھول کتنے خوبصورت اور پیارے ہیں۔ تم بھی ایک پھول ہو؟ نصیر سکرائی۔ راشد وریل چیر کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔

ہر طرف ہوا کے سوا جھونکے رہے تھے۔ فضا میں پرندے اڑ رہے تھے اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے بڑی تیزی سے اپنے پروں کو حرکت دے رہے تھے۔ ایک قطار جلنے کے بعد ایک پرندہ کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ راشد اس پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سایہ ایک لمحے کے لئے نصیر کے چہرے پر ہوا اور پھر جیسے اس پر چھائی ہوئی افسردگی کا ایک حصہ بن گیا۔

”نصیر! میں خوش تھا کہ تم سکرائی ہو مگر اب یہ روناؤش اور افسردہ کی ہو گئی ہو۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ جس کرنی کی غصوں ہوتی ہے، کوئی دیکھ ہے جس کا اظہار کرنے سے خود کو تھامر سمجھتی ہو یا مناسب نہیں سمجھتی؟ نصیر! جس کی پردہ داری ہے؟“

راشد نے اپنا سر اس کی کمری کے بازو سے دھکا دیا تھا اور اسے خود غصوں پر رونا تھا جیسے وہ یہ الفاظ عام لمبے میں نہیں مرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ کیا وہ چاہتا نہیں تھا کہ یہ بات اس سے کہے۔

نصیر کی ٹھیکس جھکی ہوئی تھیں اور ان چکوں کے نیچے رخساروں کی سفیدی جیسے کسی شفاف جھیل کے پانیوں پر روشنیوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ پھیلا ہوا ہو۔

”راشد! اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا: انسان کبھی کبھی ایک جذباتی فیصلہ کر بیٹھتا ہے وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ نہیں سوچ سکتا کہ اس کے فیصلے کا انجام کیا ہو گا۔ وہ کن نتائج سے دوچار ہو گا۔ میں جانتی ہوں تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے وقت کچھ سوچا نہیں تھا، اور مجھ پر بھی بالکل نہ سوچنے کی پابندی لگا دی تھی۔ کہا تھا نا تم نے نہیں میرا ساتھ دینا ہو گا تم میرا ساتھ دو گی۔ میں نے ساتھ دے دیا۔ تم نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔“

فیصلہ کچے جا رہی تھی: اگر تم نے نہیں سوچا تھا تو کم از کم مجھے ہی — لیکن میں — میں راشد! جب تم نے وہ لفظ کہے تھے تو تمہاری آنکھوں میں ایک ایسی سرخی چھلکنے لگی تھی جو ایک بہت مضبوط اور ناقابل شکست اروے کی علامت ہوتی ہے جو ایک ایسا تندہ و دروہارا بن جاتی ہے جس میں سب کچھ بہہ جاتا ہے تم مجھے لے آئے میں آگئی۔ آگے کتنا طویل کس قدر بچیہ، ناہموار، تاریک راستہ پھیلا ہے یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ کس منزل کی طرف جاتا ہے۔ راشد! ہم کہاں، کس طرف گئے! میری چیز دھچکتے ہوئے کہاں لے جاؤ گے؟

راشد مستانہ اور اس کا چہرہ کرسی کے بازو سے الگ ہو گیا۔

”فیصلہ! ہر انسان کا راستہ بچیہ ہوتا ہے زندگی قبر بچیہ رہا ہوں ہی سے گزرتی ہے۔ میں نہیں دھکیل کر کہیں نہیں لے جاؤں گا۔ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ میں ہر قدم پر اپنی روشنی منزل لے گی میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔“

فیصلہ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں راشد! وہ اپنے سینہ اباس میں لمبوس کاغذ کی اس کشتی کی طرح نظر آ رہی تھی جسے ان دونوں نے بہت مدت پہلے ایک گڑھے کے پانی میں بہا دیا تھا۔

”فیصلہ! کاغذ کی ناؤ اور پیار کی ناؤ میں بڑا فرق ہے کاغذ کی ناؤ پانی کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر پیار کی ناؤ تو طوفانوں سے گزر کر ساحل پہنچ جاتی ہے۔“

ٹھو خانوں سے گزر کر:

”کیوں نہیں فطیر! مجھے تہاری یہ بالوسی بالکل پسند نہیں، ہنس، سکڑاؤ۔ میں نہیں وہ سب کچھ نہ دے سکا جو مجھے دینا چاہیئے تاہم جو کچھ دے سکا ہوں وہ تو دے دیا ہے۔“
 فطیر کی چٹکیوں پر کچھ چمک رہا تھا اس نے ڈرتی اچھڑتی آواز میں کہا: راشد! تم نے بہت کچھ دے دیا ہے۔ مگر میں نے کیا دیا ہے۔ میں کیا دے سکتی ہوں؟
 اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے راشد نے اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے۔

”ایسا تم کو فطیر! تم نے بہت کچھ دیا ہے تم میری زندگی میں آگئی ہو۔ اس سے زیادہ کیا دے سکتی ہو؟ راشد کا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب جھکا ہوا تھا۔
 ”تہادی زندگی میں آگئی ہوں۔ چکی ہوئی ناگیں لے کر:
 فطیر نے دوبارہ اپنے ہاتھ آنکھوں کے اوپر پھیلا دیئے۔
 اس سے کیا ہوتا ہے فطیر!“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ پوچھتے ہو مجھ سے۔ اپنی اسی کو دیکھا ہے مجھے دیکھتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں کتنی بالوسی ہوتی ہے۔ کتنا رکھ، کرب ہوتا ہے۔“
 ”بلے و خوف مت ہو فطیر!“

”میں کچھ نہیں بن سکتی۔ کچھ نہیں۔ راکھ کا ڈھیر۔ راکھ کا ڈھیر! فطیر حجب یہ الفاظ کہہ رہی تھی تو اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا۔

”نہیں فطیر! نہیں! — ایسا نہیں ہونا چاہیئے میری بات نہیں مانو گی۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم سے کیا کہہ رہا ہوں فطیر! تم سے جو میری اپنی ہو۔ میں اپنی فطیر سے کہہ رہا ہوں۔“

فطیر نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے۔ لہو لہو اس کی اندرونی طوفانی کیفیت ختم ہونے لگی۔
 ”اس وقت تم کتنی اچھی لگتی ہو راشد نے مسکرا کر کہا اور فطیر کی آنکھوں میں جسم کی ایک

ہنگی سی لہروں ابھری جیسے درافق کا کوئی کمانہ سورج کی ازمین کرن سے چمک اٹھا ہو۔
 دن گزرتے گئے، دھیرے دھیرے، جیسے وقت کسی غیر ہوا رواستے پر سفر کر رہا ہو۔ اس گھر
 میں تینوں کی ذہنی کیفیتیں مختلف تھیں۔ راشد فصیح کے گلے میں اپنے بازو جامل کر دیتا تھا۔ اسے
 کوئی نیا مطلقہ سنا تھا۔ کوئی مزیدار بات، فصیح زور سے قہقہہ لگاتی تھی تو اس کی آنکھوں میں
 ایک چمک سی اُباتی تھی۔ پھر چند لمحوں کے بعد یہ چمک ڈب جاتی تھی اور راشد غصوں پر تھکا
 فصیح ہر ابھی اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی جس کا چہرہ اس نے اپنی گرت میں لے رکھا تھا اور
 ہنس رہی تھی، اچانک کہیں چلی گئی ہے۔ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ اور وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔
 اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ایسے میں وہ فصیح کو زور سے آواز دیتا۔
 فصیح خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگتی۔

”راشد! راشد کو اس کی یہ آواز کیسے بہت دور سے آتی ہوئی لگتی۔

فصیح بیک وقت مددیناؤں میں جی رہی تھی۔ ایک دنیا بہت تاناک اور دوسری بڑی
 تاناک ایک دنیا میں سانس پتے ہوئے وہ جلد گھبرا جاتی۔ اور بے اختیار ہی کے عالم میں یہ
 دنیا پھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی جاتی۔

آدھی آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اپنے پہلو میں وہ راشد کو دیکھتی۔ یہ میرا خورم
 ہے۔ میری دنیا۔ میرا محبوب۔ میرا — میرا — وہ اسے دیکھتی رہتی۔ اچانک اندھروں کی
 دنیا اسے آواز دے کر بلا لیتی۔

”نہیں — نہیں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ میں کیا ہوں۔ اپنا بیچ۔ محتاج۔ ایک ناکارہ
 وجود۔ وہ تجزی سے خور کو جھپے ہٹا لیتی۔ ایک ہنگی سی اس کے گلے میں پھنس جاتی۔

راشد کی ای چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ صبح سویرے ناشتا تیار کرنی
 تھیں اور صبح کو ناشتا کرواتا تھیں، ہونا ناشتے کے بعد اخباروں کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی

سچی تو وہ سودا سلف لائے کسے بازار چلی جاتی تھیں۔

راشد کا اسلام آباد میں تبادلو ہر گھیا۔ لاہور میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کرتے ہوئے اسے تین برس گزر چکے تھے اور اب اس کی ترقی کا امکان خاصا روشن تھا۔ اسے ترقی دے کر براہ کچ منیجر بنا دیا گیا۔ جب اسے اس امر کی اطلاع ملی تو اسے خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی ٹھکرندی میں بدل گئی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ کیا فیصلہ نئے اصول سے مانوس ہو سکے گی۔ یہاں پہلے میں کم از کم ایک بار اس کی بہن ریفہ آجاتی ہے۔ ریفہ نہیں آتی تو بھائی مرزا پہنچ جاتا ہے۔ اسلام آباد میں یہ ممکن نہیں ہے۔

اس نے گھبرا کر پوری کو بہ خبر نائی تو اس کے چہرے پر کوئی ایسا تغیر نہ ہوتا نہ ہوا جس سے اس کے ذہنی رد عمل کا اظہار ہوتا۔

دس دھند وہ تینوں اسلام آباد کے ایک کواڈر میں تھے۔

راشد کو نئی دنیا میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا البتہ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی بیوی کی کم گرتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ساس سے تو وہ پہلے ہی صرف مطلب کی بات کرتی تھی اور اب تو وہ ان سے کچھ اور درد ہو گئی تھی۔

فیصلہ خیر کے یک جانے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ رسالوں کا مطالعہ کرتی رہتی یا کھڑکی کے قریب جا کر اہر و کھیتی رہتی۔

ماشک کی امی اگر کہیں: چلے لاؤں؟

• خالہ جان! تکلیف دہ کریں۔

راشد کو گھر آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ فیصلہ کو کھانے کے لئے ڈانٹنگ روم میں چلنے کے لئے کہتیں مگر وہ نفی میں سر ملا دیتی: نہیں، خالہ جان؟

• تمہیں بھوک نہیں لگی؟

• نہیں، بالکل نہیں۔

ماس سند سے کچھ نہ کہتیں۔ مگر جلتے ہوئے جب زور سے کمرے کا دروازہ بند کرتیں تو صاف مظلوم ہو جاتا کہ انہیں لہجہ بھوک پر حرکت بالکل پسند نہیں ہے۔ راشد مگر لڑتا تو حسب معمول اپنی امی سے پوچھتا۔ ہر طرح خیریت ہے نا امی؟

”اس خیریت ہی خیریت ہے۔ یہ تہادی بیوی کو بھوک لگتی ہے نہ پاس؟“

راشد ہنس پڑتا۔ امی! آپ کیا جانیں میری بیوی کتنی صابر و شاکر ہے۔

راشد قبیلہ لنگر اس تلخی کو اپنی طرف سے ختم کر دیتا جس کا احساس اس کی امی کے لفظوں سے ہوتا تھا مگر آہستہ آہستہ خود بھی اس کے دل میں ایک ناخوشگوار سا مذہب سر اٹھانے لگا تھا۔ نصیر کچھ زیادہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس طرح اپنے اندر ڈوب جاتی تھی کہ شہر کی آمد کا بھی اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔

”نصیر! کیا حال ہے؟“

نصیر اسے یوں دیکھتی جیسے اس کے شوہر نے اس کے خیالوں کی دنیا پر چھاپ مار دیا ہو۔

راشد اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

”کہتے تو بصورت مناظر ہیں؟“

”ہوں؟“

”آزاد باہر چلیں؟ وہ اس سے کہتا۔“

”یہاں سب کچھ نظر آتا ہے۔ باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اسے ہال دیتی۔“

راشد اپنا چہرہ اس کے بالکل قریب لے آتا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنا مگر دلوں اسے سونے ایسے سایوں کے جو شام ہوتے ہی گنجان درختوں کی شاخوں میں اتر آتے ہیں اور کچھ بھی محسوس نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں خیال آتا۔ کیا یہ اپنے عزیز بندوں سے دور ہو گئی ہے، اس وجہ سے اس طرح چپ چاپ اور اداس سی رہتی ہے۔ کیا میں اسے وہ توجہ نہیں دے سکا جو مجھے دینا

چاہئے تھی۔ وہ اپنے اس شبہ کا اظہار کر دیتا۔

”ہنس راشد اقم نے مجھے بھرپور قہقہہ دی ہے۔ میں تو ایسا مسکے بھی نہیں سکتی۔“

راشد اور کوئی بات نہ کیا اور اسلام آباد کے ایک کمارڈر کی کھڑکی سے دھڑکے اس وقت تک اپنی نگاہیں ادھر ادھر، قریب اور دور بکھیرتے رہتے جب تک ابتدائی رات کے اندھیرے گہرے ہو کمارڈر کے مناظر کو اپنے دماغ میں ڈھانپ نہ لیتے۔

اس دن راشد اور فصیحہ کی شادی کی جو تھی ساگرہ تھی۔ راشد فصیحہ کے لئے ایک نئی ساڑھی اور ٹیکے لئے شام سے پہلے گھبرا گیا۔ مچن میں اس کی امی کھڑی تھیں اور انہوں نے گود میں ہسلے کا ایک بنڈھا رکھا اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ ان کے ہونٹ اس کے ماتھے کو چھو رہے تھے۔

راشد کو اندہ آتے ہوئے دیکھ کر اس کی امی نے جلدی سے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا مگر راشد کو ایک ہی لمحے میں ان کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی حسرت کا امانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہ کہا، کمرے میں گیا۔ فصیحہ کھڑکی کے پاس نہیں تھی۔

دوسرے کمرے میں ہو گئی۔ اس نے سوچا اور ددو رائے سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کے کان میں ہلکی سی آواز آئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے اٹھ بٹھا کر بجلی کا بلب روشن کیا۔

فصیحہ کی کرسی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ سامنے دیکھ رہی تھی، کمرے کی دوسری کھڑکی میں سے جو مچن میں کھلتی تھی۔

”فصیحہ! راشد نے یہودی کو مخاطب کیا۔“

فصیحہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی

راشد اس کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

”فصیحہ! کیا ہے۔“ وہ اس کی طرف جھکنا کہ ساڑھی کا پیکٹ اس کے حوالے کرے کہیں

مٹا جیسے فصیح کا اندرونی ہندوٹ گھیا ہے۔ وہ رونے لگی۔

”فصیح! دیکھو۔ دیکھو تو۔“

”کیا تم نے شادی سے پہلے مجھے دیکھا نہیں تھا کیوں لے آنے مجھے۔ مجھ پر کار و حود کو۔ مجھ
ایمان کو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے، کیا جرم کیا ہے میں نے کیا فریب دیا ہے تم لوگوں کو
میں کچھ نہیں دے سکی۔ میں کچھ نہیں دے سکتی۔“

بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے اور الفاظ اس کے ہونٹوں سے بہتے چلے جا رہے
تھے۔ اس کا سارا بدن بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ گنگا تھا کہ وہ اسی طرح کا اپنی رسی توہمیل چیز
سے گھر پڑے گی۔

راشد نے پیکٹ ہنگ پر ہلکا دیا اور اس کا بازو حقم لیا۔

”نہیں فصیح! ایسا نہیں کہتے۔“

”میں نے کب کہا تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں لے آؤ۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ میں کبھی بھی
نہیں چاہتی تھی۔ کیا مجھے پتھر کا ٹکڑا سمجھ رکھا ہے کہ میں خالہ جان کی حسرت نہ سمجھ سکوں۔ تمہاری
آرزو نہ جان سکوں۔ میں۔۔۔ سیکارہ سہی، جلتا ہوا کولہ۔ میں۔۔۔ اوہ میرے اللہ۔ میں مرکبوں
نہ لگتی۔ مرکبوں نہ لگتی۔“

راشد نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

”فصیح! تم بہت کچھ ہو۔ تم سب کچھ ہو۔ میں کہتا ہوں فصیح! تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم بڑا دل
میں ایک ہو۔“

فصیح کا ربا ہوا ضبط بھی ختم ہو گیا۔ اس کے آنسو ٹھنڈے ہی ٹھنڈے تھے۔ اس کے اندر شکست و محنت
کا عمل تیزی سے جاری تھا۔

”راشد! راشد کی امی کی آواز نہ گونجی۔ وہ ان کی طرف آ رہی تھیں۔“

”آخر یہ کیا تاثر ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کیا بے انصافی کی ہے اسے کیا کچھ نہیں دیا۔ اسے

کبھی سخت بات کہی ہے۔ کبھی بدسلوکی کی ہے۔ اس کا کوئی حق چھینا ہے اس نے ہم سے
بہادی آرزوئیں چھین لیں۔ ہم نے تو اس سے کچھ نہیں چھینا۔

راشد بیوی کا بازو اور ہاتھ چھوڑ کر اپنی ماں کی طرف بھاگا۔

”ای کیا کرتی ہیں آپ۔ خدا کے لئے خاموش رہیے۔ چپ ہو جائیے امی! آہ وہ ماں
مردہ راز سے کی طرف لے جانے لگا۔

”میں پرچھتی ہوں۔ یہ لڑکی چاہتی کیلے ہے آخر؟“

”کچھ نہیں چاہتی امی۔ کچھ نہیں چاہتی۔ خدا کے لئے امی۔ جا بیٹے۔ امی جا بیٹے۔ امی
باہر جانے لگیں۔

”ہم نے تو اسے پسینے سے لگایا تھا۔ زمین پر گر گئی ہے تو گرے؟“

ماں چلی گئیں ان کی آواز باہر سے بھی آ رہی تھی۔ لیکن راشد نے اس کی طرف سے گویا

کان بند کر لئے تھے۔ وہ بیوی پر جھکا ہوا تھا۔ نصیر کا بدن اب کانپ نہیں رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں سے جو کچھ نکلتا تھا وہ شاید نکل چکا تھا۔ اس کا جہرہ زرد ہو گیا تھا۔ بے حس بے ہوش
راشد ڈر گیا۔ اسے بیوی کی یہ کیفیت خطرناک لگی۔ وہ اس کی سادی توجہ، سارا دھیان
ایک ایسے مرنوع باسٹل میں مشغول کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں پھیلی ہوئی تلخی ختم
ہو جائے۔ اس نے سادھی پلنگ سے اٹھا کر اس کی گردن میں رکھ دی۔

”میری طرف سے تمہیں پسند آئی؟“

”مہربانی، شکریہ؟“

”واقعی تمہیں پسند ہے؟“

نصیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کی بیوی کی کیفیت اطمینان بخش تھی لیکن ایک اندوہنی خوف تھا جو راشد کے بالوں میں

ریگ رہا تھا۔

راشدہ کو نصیحا آنے والے دنوں میں بالکل نارمل نظر آئی۔ اس کی کوئی حرکت، کوئی بات خلاف معمول غموں نہ ہوں۔

سال کا آخری ہفتہ گزر رہا تھا۔ ان دنوں یک کلام بہت بڑھ جاتا ہے۔ راشدہ ہر روز دیر سے گھر آتا تھا۔ اور ایک شام وہ سات بجے کے قریب آیا تو پہلی ہی نظر میں اس کی چھٹی جس نے اسے بتا دیا کہ کچھ ہو چکا ہے۔

اس کی امی بامدہچی خانے میں تھیں۔ ملازمہ بازار سے کچھ سودا لاکر بامدہچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔

”نصیحا کہاں ہے؟ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
ملازمہ کچھ کہنے کے لئے دکی ہی تھی کہ بامدہچی خانے میں اس کی امی باہر آگئیں۔
”چلی گئی ہے۔“

”کون امی؟ راشدہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ نصیحا اس انداز سے چل جائے گی۔

”کون جا سکتی ہے۔ اس گھر میں میرے قریبے سوا اور کون رہتا ہے؟

”پر امی! اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”کیوں کرتی۔۔۔ مجھ سے دکی طور پر کہا تھا۔ میں جا رہی ہوں۔ اس کا مہائی چھٹی لے کر آیا تھا۔

”تھاری جیوتی نے خط لکھ دیا ہو گا۔ باقاعدہ منصوبہ بنا کر آیا تھا۔“

اور اس کی امی ایک بار پھر پھٹ پڑی۔

”یہ ناز۔ یہ غرور۔ ہے کیا اپنا بیچ۔ اللہ بچائے ایسے لوگوں سے۔ نہ کسی کے احسان کا خیال۔

”اپنی بے کسی کا احساس۔ ہونہر۔“ اس کی امی بولے جا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کمرے کے اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

تین ماہ گزر گئے بالکل خاموشی سے۔ راشدہ لاہور نہ گیا۔ ادھر سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی۔

چوتھے مہینے کے دوسرے ہفتے کلہا ہلاؤں گزر رہا تھا کہ وہ یک سے گھر آیا تو اس کی امی

نہا سے ایک خط دریا۔ یہ خط مصیبت کی طوفان سے آیا تھا۔ بہت مختصر صرف ایک سطر کسی تھی۔
 ”میں انتظار کر رہی ہوں۔ آجائے۔ خط میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔“

اس نے خط پڑھا۔ دوسری مرتبہ پڑھا۔ اس کی امی اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔
 ”کیا ارادہ ہے؟“ ماں نے سوال کیا۔

”اس نے مجھے بلایا ہے۔“

ان کا چہرہ یک لحظ سرخ ہو گیا۔ تم نہیں جاؤ گے۔ کیا ہم نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ کیا
 ہم نے اشارہ بھی کیا تھا کہ اپنے بچے چلی جاؤ۔ خود گئی ہے۔ خود گئے۔
 ”گرا می۔ دیکھئے تو۔“

”کیا دکھانا چاہتے ہو اب۔ تم نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ میں نے کوئی رکاوٹ ڈال دی تھی کہ تم کو منع
 کیا۔ میں نے تو اس کے ساتھ اپنی عذریوں کو بھی گلے سے لگا لیا۔ بلو، کیا چاہتے ہو۔ خود گئے۔
 اس گھر کا دروازہ کھلا ہے۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔“

اس نے ماں کی آنکھوں میں آنسو باریق اس وقت دیکھے تھے جب اس کا باپ دنیا سے
 رخصت ہوا تھا یا اب دیکھ نہ سکتا۔

”رو نہیں امی، رو نہیں؟ اور وہ ماں سے پٹ گیا۔“

خالی خالی کمرہ اور اس دیوار میں، فضا میں ایک گہرا کرب سا ہوا۔

راشد خود کو بے اختیار کرسی میں گما دیتا۔

کیا اس کمرے کی درستی اس سے تھی؟ اس کی شخصیت میں کتنا اثر تھا کہ اس نے اس کمرے
 کو اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔ وہ نہیں ہے تو یہ سب کتنا ہے جان، ویران، غم زدہ محسوس
 ہوتا ہے۔

وہ آنکھیں بند کر کے کھڑکی کے پاس بیٹھا رہتا۔ امی کھانے کے لئے آواز دیتیں تو وہ بڑھیل

قدموں سے میز پر جاں۔ چپ چاپ سوائے منہ میں رکھتا رہتا۔ ماں پوچھتی: کیوں بیٹا۔ غیر تو ہے۔
 ”میں، وہ۔ امی: ٹھیک ہوں، ٹھیک ہی تو ہوں۔“

”کھانا اتنی بے دلی سے کیوں کھا رہے ہو! اچھا نہیں کیا۔ یہ دلی کی گچی، دھیان سے کھانا
 نہیں پکان۔“

”کھانا مزیدار ہے۔ وہ امی۔ ذرا ایک دوست نے چائے کے ساتھ کئی چیزیں کھلا دی
 تھیں۔“
 ماں سکوائے لگتی۔

”یہ تمہارا کیا دوست ہے۔ دذاتی سادی چیزیں کھلا دیتا ہے۔“

اس صبح وہ بنگ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے یاد آیا کہ آج اسے پنڈی میں ایک
 مینگ میں شامل ہونا تھا، جاہلوں گھنٹہ بنگ میں صرف کرنے کے بعد وہ دیگن میں بیٹھ کر پنڈی
 روانہ ہو گیا۔

مینگ مقررہ وقت سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ وہ دفتر سے باہر آیا اور دیگن کا انتظار کر رہا
 تھا کہ اچانک اس کا سانس تیز تر چلنے لگا اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک شخص سبیل چیز
 کو دیکھ کر رہا تھا۔ کرسی پر ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔

وہ مسلسل اس منظر کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ دونوں۔ کرسی اور اسے حرکت دینے
 والے۔ دونوں اصغر مال کے جھوم میں غائب ہو گئے۔ اس کے اندر ایک گرم رد چلی رہی تھی
 جس کی حدت بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ لہو بہ لہو رہتی جا رہی تھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب دیگن آئی اور اس کے قریب چند منٹ رک کر آگے بڑھ
 گئی۔ اور پھر وہ اچانک لاہور جانے والی دیگن میں سوار ہو گیا۔

اس کی میسج سوینی روڈ کے ایک پرانے مکان کے دروازے پر رک گئی۔ کمال بیل پر انگلی
 رکھ کر وہ دروازہ کھینے کا انتظار کرنے لگا۔

دردانہ کھل گیا اس کی نظریں رفیعہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔
 رفیعہ نے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا اور دردانہ کے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اند
 گیا۔ رفیعہ اس کے آگے آگے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔
 ”آپ آگئے ہیں۔“ رفیعہ نے پہلی مرتبہ دوسری طرف بھرا کر کہا۔
 ”نصیب۔“

”خبریں مل سکتے؟“
 ”جیسے خواست ہے رفیعہ۔ خط بھی مل گیا تھا۔ اس سے کہو:
 ”رفیعہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”وہ اگر دنیا میں ہوتی تو۔“

راشد کو مائس اپنے سینے میں رکنا ہوا غموس ہوا۔
 ”ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ اور۔۔۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔
 راشد صوفے کے قریب کھڑا تھا۔ کمرے کی ہر چیز اس کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اسے
 رفیعہ کی آواز کسی دور دراز مقام سے آتی ہوئی غموس ہوئی۔
 ”اس نے کہا تھا جب بھی تم آؤ۔ یہ امانت تم کو دے دی جائے۔“
 راشد نے سامنے دیکھا۔

رفیعہ چاروں طرف لپٹی ہوئی کوئی شے بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی
 ”اس نے کہا تھا۔ مجھے صاف کر دینا۔ میں آپ کو کچھ نہ دے سکی۔“
 بچہ رونے لگا تھا۔ رفیعہ اسے اٹھائے اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو گہے تھے۔
 اندھنی طوفان پر تابا پانے کی کوشش میں اس کے چہرے کی بکریں ابھرا آتی تھیں۔ ڈیپلے پھیل سے گئے تھے۔
 راشد کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس وقت وہ آگے بڑھا۔ کب اس نے اپنے بازو بھیلانے
 اور کب دوتے چڑھنے کے اپنے سینے سے لگایا۔

علیا کی طلی

وہ دن جمعرات کا تھا۔ رات کے پچھلے پہر ہی سے فضا میں بادل اٹھنے چلے آ رہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا صبح سے شام تک ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی سو سلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور جو لوگ گھروں سے باہر کام کاج میں مصروف ہیں ان کے لئے واپس آنا ایک مسئلہ بن جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ناعم علی چنتی دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا جود ہوتا رہا اور بے کسی کے عالم میں بے وقت گزارتا رہا۔ وہ جب سے ریلوے کے ٹکے میں بیٹیس برس مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ریٹائر ہو گیا تھا۔ دن کے تین چار گھنٹے لازماً اپنے پرانے اور نئے اجلباب سے ملاقات کرنے اور ادھر ادھر گھوم پھر کر گزارتا تھا۔ ایک لمبی مدت تک عمر بھر نفس بہنے کے بعد اسے آزادی ملی تھی اور وہ اس آزادی سے بھرپور اپورا ناٹھ اٹھا نا چاہتا تھا اب اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہو سکتی تھی۔ بچے برس روز گزار تھے۔ کسی کا وجود بھی اس پر بوجھ نہیں تھا۔ بیوی ذہین، سلیقہ مند اور مستقل مزاج خاتون تھی جو ناگوار سے ناگوار احوال میں بھی خوش رہ سکتی تھی۔ اس لئے وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بے ٹکری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

اس روز وہ گھر سے باہر نکل سکا تو اسے بڑی کوفت ہوئی وہ سمجھ چکا تھا کہ اب مزید انتظار کرنا فضول ہے اور وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگا کہ بارش ہونے لگی اس حالت میں وہ کیسے کہیں جا سکتا تھا!

بارش دو گھنٹے کے بعد ختم ہوئی چنتی نے رستہ راج پر ایک نظر ڈالی ۹۰ بج چکے تھے۔ وہ گیارہ

سے بہتر چنگ پر لیٹا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ مطالعے کے بعد اس کی آنکھوں میں نیند آتی تھی۔
 گویا ابھی سو جانے کی کوئی ٹھگ نہیں تھی۔ اس نے دین کوٹ پہنا، پھرتی داتھ میں لی اور
 اپنی بیوی کو اطلاع دے کر گھر کے دروازے سے نکل گیا۔

بادلوں کا بحجم فضا میں معلق تھا۔ ہوا سرد تھی اور سڑکوں بازاروں میں پندہ میں منٹ
 کے بعد آٹا دکھا آدھی دکھائی دے جاتا تھا۔ دن بھر کی کوفت دور کرنے کا ایک مناسب ذریعہ
 اس نے ہی خیال کیا کہ چلتا چلا جائے اور جب تک خشک نہ جلے واپس نہ آئے۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے، اچانک اس کے کان میں انجن کی سیٹی گونج اٹھی
 اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ سٹیشن کے قریب آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر وہ سافرخانے میں پہنچا
 رہا۔ تھکاوٹ غصے کے ایک بیخ پر بیٹھ گیا اور پھر واپس جانے لگا۔

اپنے گھر کے دروازے سے کچھ دور ڈک کر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے میں تین
 منٹ باقی تھے۔ دو گھنٹے گھومتا رہا ہوں۔۔۔ یہ بات اس نے اپنے آپ سے اس مقصد کے
 زیر اثر کہی کہ اب وہ خشک گیا ہے تو اس میں حق بجانب ہے۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے کوٹ اتار کر کرسی کے بازوؤں پر پھیلا دیا۔ پھرتی کوٹے میں
 رکھی۔ شب خرابی کا لباس پہنے ہی والا تھا کہ کمرے کی کھڑکی میں سے ڈرائینگ روم میں روشنی
 دکھائی دینے لگی۔

رات کے گیارہ بجے ڈرائینگ روم میں روشنی آسے حیرت ہوئی۔ گھر میں اس کی پری
 کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ درجہ دیر تک باہر چلی خانے میں ہی مصروف رہتی تھی۔ یا باہر چلی تاکا
 کے باہر سٹان دینے کا کام کرتی تھی۔ ڈرائینگ روم میں نہیں جاتی تھی تو آج ڈرائینگ روم
 میں روشنی کا مطلب کیا کوئی پہان آ گیا ہے یا کہیں گھر میں کسی کی طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی
 ہے اسی اثنا میں دروازے کا پردہ ہٹا کر دیکھ آگئی۔

ایک صاحب پورے ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں زحید نے اسے بتایا۔

ہمکن ہیں؟ چشتی نے پوچھا۔

رضیہ اپنے شرمہر کے اکثر احباب کو جانتی تھی۔ ان کی بیویاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ کوئی دوست آتا تھا تو وہ اس کا نام لے کر ہی آنے کی خبر ملتی تھی۔

چشتی نے یہی کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کیا تم اسے نہیں جانتیں۔ رضیہ نے اس کی نظروں کا مہووم سمجھ لیا۔ بولی: نہیں۔ میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا۔

”کون ہے یہ شخص جو ایسے خراب موسم میں ایک گھنٹے سے اس کا منتظر ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا۔ چلو۔ دیکھتا ہوں: شرمہر کی نہان سے یہ لفظ سن کر رضیہ دودانے سے ہٹ گئی۔ اور اس شخص سے کھانے کی میز کے سامنے الماری میں سے چائے کے برتن نکالنے لگی کہ شاید اب اسے یہاں کے لئے چائے تیار کرنی پڑے گی۔

جب تک وہ برتن نکالے چشتی ڈرائنگ روم کے اندر جا چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کرسی پر ایک بٹھا آدمی بیٹھا ہے لباس بہت سادہ، مراد وادھی کے بال بڑھے ہوئے چشتی کو اٹھ اٹے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

چشتی اپنی زندگی میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

”تشریف رکھیے؟“ اس نے ٹکٹا کہا اور کرسی کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ امر علی چشتی ٹریل کے گھر میں نا؟“ اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کہنے والا ان پڑھ ہے۔

”جی ہاں۔ فرمائیے اس وقت کیسے تکلیف دہ؟“

”انجمنی نے ذرا عرصے چشتی کے چہرے کو دیکھا، اور بولا: ہسپتال میں ایک بیمار نے آپ کو بلایا ہے۔“

”ہسپتال میں ایک بیمار نے مجھے بلا لیا ہے۔ کون ہے وہ؟“ چشتی نے پوچھا۔

”اجنبی چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا: آپ خود دیکھ لیں گے۔“

چشتی کے ذہن میں نوراً خیال کیا کہ اس کا کوئی دوست ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے یا ایسا حادثہ کسی عزیز کے ساتھ پیش آیا ہے بولاً مہر لیل کر کے حلف کیجیے کوئی نہیں وہ صاحبؔ

اجنبی نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

چشتی کے ذہن میں ایک کشمکش سی رہا ہو گئی۔ اسے جانا چاہیے یا نہیں۔ اجنبی کے مطلق اس کے ذہن میں یہ تاثر بھی ابھرا کہ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص منصوبے کے تحت اس گھر سے باہر لے جانا چاہتا ہو۔ اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ شاید کسی واقف کار کو جو اس وقت ہسپتال میں ہے اس کی ضرورت پڑ گئی ہو اور اس نے اسے بلوایا ہو۔

اجنبی نے اس کے خیالات اس کے چہرے کے تاثرات سے بجانب لئے تھے۔ کہنے لگا۔ ”جناب، اللہ جانتا ہے میں آپ کو دھوکا نہیں دے گا میں آپ کو دھوکا دے بھی کیسے سکتا ہوں۔ خدا کے لئے دیر نہ کیجئے۔ کیا پتا وہ“

چشتی نے دیکھا کہ یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز گلو گیر ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر کرب اور دکھ کے گہرے سائے پڑنے لگے ہیں۔

ایک منٹ تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ چشتی کی کشمکش مدھم پڑ گئی۔ اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا اگر بیوی سے اس مسئلے میں شور مچا کر تلے تو وہ اسے ہرگز جانے نہیں دے گی۔ تو جی رات کو ایک اجنبی کے کہنے پر اس کے ساتھ گھر سے نکل جانا وہ کسی صورت میں مناسب نہیں سمجھے گی مگر اس کا دل بہتا تھا یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔

”چلتے صاحب! بہتر یہ تھا کہ آپ مجھے صبح بات بتا دیتے اس صورت میں“ ریزر اجنبی نے اس کا دلیلاں ہاتھ اپنے ماتھے میں لے لیا۔ ”اللہ جانتا ہے ایک بیلادی نے آپ کو بلایا ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔“

چشتی ڈیڑھ گنگ روم سے باہر نکلا۔ کچن کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ رضیہ خواب گاہ میں

چلی گئی تھی کیونکہ چشتی نے اسے چلنے بٹکنے سے روک دیا تھا اس نے کوٹھی کے عقبی حصے میں جاکر راجو کو رکھ لیا اور اسے ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔

راجو نے پوچھا کیوں صاحب جی! خیر نہیں۔

”خیر بے راجو میاں! خیر ہے۔ ٹھکر کی کوئی بات نہیں۔ خود چلو“

اجنبی انگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور چشتی پچھل سیٹ پر۔ راجو کی بیوی نے کوٹھی کا مین گیٹ بند کر لیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو بونڈا پاندی ہو رہی تھی اور جب وہ کھینکے گاڑی کو تھوڑی سی گھما کر بارش ہونے لگی۔ ہندو سول منٹ بعد گاڑی ہسپتال کے اندر داخل ہو گئی۔ گاڑی میں سے پہلے اجنبی اتر اچھر چشتی باہر آیا ڈرائیور باہر نکل کر گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا مگر وہ کہ چشتی کے ذہن میں یہ خیال ابھر آتا تھا کہ آخر یہ معاف کیا ہے کسی شخص نے اسے اپنے پاس بلا رہا ہے!

اجنبی آگے آگے چلا جا رہا تھا اور چشتی پیچھے پیچھے یہ وہ ہسپتال کی پیا لکھٹ وارڈ تھی جس کے اندر اجنبی چشتی کو لے گیا تھا۔ ایک بیڈ کے قریب پہنچ کر اجنبی کے قدم رک گئے۔ اس بیڈ پر ایک بوڑھا شخص بٹا تھا۔ سخت نحیف و زار ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس آدمی کو بھی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”چشتی صاحب! اسے پہچانتے ہیں؟“

چشتی ٹھنکی باز ہے اس اجنبی کو دیکھنے لگا۔ مریض نے بیٹھنے کی سعی ناکام کی۔ اس کا سر بچے سے ذرا اوپر ہوا اور پھر گر پڑا۔ فریاد تھا کہتے ہیں اس کا چہرہ بالکل بے جان نظر آ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟ چشتی کے ذہن سے اس کی اپنی آواز نکلائی۔۔۔۔۔“ آخر یہ کون ہے؟ آواز دوبارہ مرتبہ نکلائی۔ مریض کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور پہلا اجنبی اس کے سر کے نیچے ٹکیہ درست کر رہا تھا۔ جب سال عدوی مرتبہ چشتی کے دماغ میں ابھر تو اپنے پیچھے ایک سہمی ایک غمناک سی حقیقت کا نقش بھی چھوڑ گیا۔ ان لوگوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ اجنبی غلط آدمی کو لے آیا

ہے۔ میرا اس مریض سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے بیشتر اپنی پوری زندگی میں اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔

مریض کے چہرے پر ایک کھنڈاڑا آگیا تھا، شاید اس وجہ سے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہ جس کا تھا۔ پہلے اجنبی نے تکیہ درست کر لیا تھا اور اب دھشتی کو اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہر جھرمٹا ہوا کیوں آپ نے اسے پہچان لیا ہے۔ دھشتی بدستور حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اچانک ٹن کی سی آواز آئی اور دھشتی نے دیکھا کہ اجنبی نے مریض کے نیچے کے پاس پڑی ہوئی ایک ٹی کو اٹھا لیا اور اسے ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔ ہسپتال میں ایسی ٹیبل مریض کو اپنی چیزیں رکھنے کے لئے ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔

ٹن ٹن ٹن دھشتی کے کانوں میں ٹی کی آواز مسلسل گونجنے لگی اور مریض کے بکھرے ہوئے فقرات ایک دوسرے سے ہیوست ہو کر ایک چہرے کے خود خال میں منتقل ہونے لگے۔ وہ ہسپتال کے ماحول سے دور ہونے لگے۔ دور ہوتا چلا گیا اور ایک منظر اس کی نگاہوں تلے بھرنے لگا۔

ایک دوہرا چمچلاتی ہوئی دھوپ دھشتی اس روز ذرا علیل تھا۔ دھشتی نہیں جاسکا تھا۔ چھت کا کچکا فل بیسٹ پر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے میں نیچے سرک پر ادھیڑ مرکا ایک شخص ڈھول بجانے والے کے ساتھ ٹی جانا ہوا گھر سے لگا۔ وہ کسی نرم کے سفید اور اسٹان آٹے کا اعلان کر رہا تھا۔ ٹی والے نے دھشتی کو دیکھا تو ٹک کر ٹی بائیں ہاتھ میں لے کر وائس ہاتھ کی تھیلی پر ٹنوں سے لگانے لگا۔ حلف ظاہر تھا کہ پانی مانگ رہا ہے۔

دھشتی خود آٹھا نیچے آیا اور ٹی والے کے ساتھ ڈھول والے کو بھی ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ دونوں کو دو دو گلاس خربت کے دیئے۔ اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد حکم ادا کر کے پہلے گئے۔

کیا یہ وہی ٹی والا ہے؟ جیسا وہی ہے۔

اجنبی نے قسری مرتبہ سے استفسار طلب نظروں سے دیکھا تو ہشتی میں ایک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا گویا اسے پہچان چکا ہے۔ کب سے یہ حالت ہے؟ ہشتی نے پوچھا۔

اجنبی نے اپنے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو لہرا دیا، اس کا مطلب پانچ ماہ بھی ہو سکتا تھا اور پانچ دن بھی۔ مریض نے آنکھیں کھول دیں تھیں، اس نے سر کو ذرا جنبش دی۔ اجنبی نے ہنک کر اپنا دایاں کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ مریض کی گداز بہت خف اور گداز مٹی۔ ہشتی کو کچھ بھی ملنا نہ دیا۔

اب اجنبی نے اپنا کان مریض کے ہونٹوں سے ہٹا لیا اور بولا: "علیا کہہ۔ میں مر رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔" "تلی میری مدد ہے۔ میں اسے کسی کو نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے بہت ہنسی پڑی ہے۔ یہ میری مثال ہے آپ کو دیتا ہوں" مریض نے تلی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اسے ذرا اوپر اٹھالیا۔

"اے لو ہاڈ! اجنبی نے کہا۔ ہشتی نے تلی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"پراس کا کوئی ریشا بی بی؟

مریض نے ہشتی کو کچھ کہتے ہوئے پایا تو اجنبی کو انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔

"باز کہتا ہے علیا کا اپنا کوئی ریشا۔" اجنبی نے ذرا ہلک کر کہا۔

مریض نے تو کچھ نہ کہا، اجنبی بولا: "دینا میں صرف ایک ریشا ہے۔"

مریض کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

"چلو ہاڈ۔ علیا کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اور اجنبی ہشتی کو گاڑی کے پاس چھوڑ دیا۔

واپس اپنے مریض کی طرف چلے لگا۔

گاڑی کب ٹلٹ ہوئی، کس رفتار سے چلی، کن راہوں سے گزری ہشتی ان باتوں سے

بے خبر۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا تلی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی اور وہ ابھی تک اپنی

آنکھوں کے سامنے اس کمزور ضعیف اور بے بس مریض کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے یو ٹی وی تھی۔ کیا وہ اسے اپنے کسی وارث کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اپنا ایک بیٹا بھی تو ہے جس کے ذکر پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ کیا وہ بیٹا کہیں بہت دور چلا گیا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے نہیں آ سکتا۔ بیٹا نہ یہی کوئی اور رشتہ دار قریب ہو گا۔ میں نے اس کی پیاس بجھائی تھی یہ بہت معمولی شے ہے۔ اس لگی کا بدلہ اس نے مجھے یہاں کو اپنی ٹی جہاز سے بہت عزیز ہو گئی میرے سپرد کر دی ہے۔ میں اسے کیا کروں گا۔ میرے لئے تو یہ ایک بے کاری شے ہے، کہاں دکھوں گا اسے؟

گاڑی کو تھپی کے دورانے پر رک گئی تھی۔ ایک منٹ گزر گیا تھا اور گاڑی کا بچھا گیٹ نہیں کھلا تھا۔ جیسی ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا وہ خود دورانہ کھول کر باہر نکلا تھا مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی تھی۔ راجہ نے باہر نکل کر گیٹ کھولا اس وقت جیسی کو صورت حال کا علم ہوا۔ اس نے تلی پکڑی اور باہر آ گیا۔

راجہ نے تلی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ صاب جی! یہ کیا ہے؟

”کچھ نہیں۔ دورانہ کھلاؤ؟“

راجہ نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اس کی بیوی جو غائب جاگ رہی تھی، اس نے آکر جلدی سے دورانہ کھول دیا۔ خواب گاہ میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ رضیہ کو اس ساری کا سدھائی کا کوئی علم نہیں ہو سکا تھا۔ جیسی نے تلی ڈرائنگ روم کی چٹائی پر رکھ دی۔ لائن آف کی اور چاند کو خواب گاہ میں چلا جانے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے پاؤں دورانے کی طرف اٹھتے ہی نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر علیا اس کے سامنے آ گیا اور ایک بار پھر وہی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ ... علیا نے اپنی تلی اس کے حوالے کیوں کی ہے؟

وہ قریب قریب ایک گھنٹے تک جاگ رہا۔ آخر ضرورگی ایک عباد کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اترا آئی اور وہ وہیں سو گیا۔ اور اس وقت بیدار ہوا جب اس کی بیوی اس کے

اوپر چٹکی ہونی حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”رات آپ بستر پر لیٹے؟ رضیہ کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ کچھ پگ کی پابنتی پر چادر دھوئی کی دھبی پڑی تھی۔ اس کا شوہر سوتے وقت چادر اپنے اوپر ڈال بیٹا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ چشتی نے اسے ساری رات سواد منادی۔

”یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہ بول۔

”میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔۔۔ بہر حال وہ ٹکی پڑی ہے۔“

رضیہ نے ٹکی کو طور سے دیکھا۔ یہ ضرور اسے بہت پیاری ہو گی۔ رنگی کبھی رائیگاں نہیں جاتی:

”تم کہنا یہ چاہتی ہو کہ اس نے ٹکی دے کر اس رنگی کا بدلہ چکایا ہے؟ چشتی نے سوال کیا۔

”وہ اور کیا دے سکتا تھا؟“

رضیہ نے چند سیکنڈ کے لئے ٹکی کو اٹھایا اور پھر اسے رہیں رکھ دیا۔

”آج جمعہ ہے۔ رات آپ ٹھیک طرح سوئیں گے، ناشتہ کر کے سو جائیں؟ یہ کہہ کر رضیہ

فدائنگ روم سے نکل گئی۔

ساڑھے نو بجے تھے جب چشتی ناشتہ کر کے، اخبار پڑھ کر اور تین غزوی خط لکھنے کے بعد نادر شا

ہوا جلاہاس تبدیل کر کے وہ خوب گاہ میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹ بھی گیا لیکن اس وقت سونا وہ

بند نہیں کرنا تھا۔ اچانک اسے غلطی کا خیال آ گیا۔

”اب اس کی کیا حالت ہو گی۔ مجھے ہسپتال جانا چاہیئے۔“

اس کے ذہن میں ایک خلش سی چوڑی لگی۔ اس نے ایک ماں بلب مریض کو دیکھا تھا وہ اس

سے کیسے بے نیازہ سکتا تھا! رضیہ سے راجہ کے متعلق مہمانت کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کام کے لئے

ہاتھ دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک آہائے چشتی صحن میں آ گیا۔ تودہ گھنٹہ گزر گیا اور راجہ نہ آیا۔ چشتی

اس کے باہر آیا کہ کونٹے کر چلا جانے کو رات دلا اجنبی اسے قریب سے اپنی طرف آتا ہوا

دکھائی دیا۔

”بازجی! علیا نے آپ کو سلام کہا تھا! اجنبی نے قریب آکر کرناک لمبے میں کہا۔
چشتی نے اسے رکھا۔ اس کی آنکھیں سنبھلی ہوئی تھیں۔ چہرہ دیران اور انصرونہ تھا۔ گھروس
پر جا بجا دھنسنے سے بڑھے تھے۔

”آپ چلے آئے تو تھوڑی دیر بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی اور جب صبح کے چھ بجے
ہوں گے کروہ۔۔۔“

”مر گیا! چشتی نے بھراں ہوئی آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں۔ بازجی۔۔۔“

”بہت انوس ہوا! چشتی نے یہ الفاظ کہہ کر ایسے انداز سے رکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ پھر کیا ہوا
”بازجی علیا کے بہت سارے دوست ہیں۔ میں نے ایک آدمی کے گھر جا کر اسے بتا دیا اور
واپس آگیا ایک گھنٹے کے اندر قرعہ چودہ لوگ آگئے اور علیا کو بیانی صاحب میں دفن کر دیا۔
بازجی علیا نے دم کم ہونے سے بچا اس برس تک ٹی بھلاں تھی۔ ہر نگل میں چڑیاں ہیں اور ہر پیلے میں
دہی ٹی بھاتا تھا۔ فرسوں اور کارخانوں کے مالک اپنی چیزوں کی شہودی کرانے کے لئے اسی کو بلواتے
تھے۔ بازجی! علیا! بڑا دلچسپ تھا بے چارہ۔ یہی جوانی میں مر گئی۔ اس نے دوسرا بیواہ ڈکیا کو سونپی
ہاں اس کے لڑکے سے اچھا سلوک نہیں کرے گی، پر اللہ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بازجی! علیا کا
رہنا منظور ابھی صحبت سے خوب ہو گیا۔ اس کا بڑا دکھ تھا علیا کو۔ وہ نشہ پانی کرتا ہے، بیکوں میں
پڑا رہتا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے سب کچھ ہی اگل دیا تھا۔
”تم اس کے دوست تھے؟ چشتی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میرا ٹکڑا یا ر تھا جی۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ سب سے اچھا دوست کن ہے تو

وہ ضرور کہتا ابراہیم؟

”تم ابراہیم ہو؟“

”جی ہاں۔“

”تو ابراہیم ایک بات بتاؤ۔ تم کہتے ہو تم علیہ کے منگو ٹیپا رہتے۔“

”سچ کہتا ہوں باؤجی؟ ابراہیم بے باطل سے بولا۔

”میں اسے سچ ہی مانتا ہوں۔ مگر میں ایک بات نہیں سمجھ سکا کہ وہی تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم سب کو چھوڑ کر علیہ نے قبیلے چھوڑ دی؟“

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ یہ سوال سن کر وہ مضطرب ہو گیا ہے۔

”اللہ جانے باز۔ یہ بات میں بھی نہیں سمجھ سکا۔ کئی دفعہ اس نے تمہارا ذکر بڑے پیار سے کیا تھا۔ کہتا تھا۔ جنتی صاحب نے شریعت پلایا تھا تو میری جان میں جان آئی تھی۔ تمہارا بڑا احسان مانتا تھا باؤجی اور کوئی بات نہیں تھی۔“

ابراہیم کچھ دیر اور بیٹھا رہا وہ علیہ کی باتیں کرتا رہا۔ پھر جانے لگا۔

”اچھا باؤجی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔ علیہ کے لئے دعا مانگ دیا کریں۔ بڑا اچھا آدمی تھا باؤجی۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

”میں علیہ کے لئے کراچی سے آیا تھا باؤجی۔ وہاں میرے دونوں طرف کے رہتے ہیں۔ اچھا کالابار ہے ان کا۔ ان کے پاس رہتا ہوں۔“

ابراہیم چلا گیا۔

اس دفعہ یہاں آئے۔ جنتی بزمانی کے غرض میں مہنگ ہو گیا۔ لیکن وہ سوال بار بار اس کے ذہن میں کھینکے لگتا تھا کہ علیہ نے اپنی قبیلے اس کے سپرد کیوں کی تھی جب یہاں رخصت ہو گئے اور صرف خواتین وہ گئیں جنہوں نے رضیہ کو گھیر رکھا تھا۔ جنتی ناراض تھا وہ اپنے گھر سے یہ چلا گیا۔ عادت کے دس بیچ چلے تھے وہ دور روز پرانے اخبار کے صفحات پر سرسری نظر ڈالتے لگا۔ ایک خبر پر اس کی نگاہ رک گئی۔ لکھا تھا۔ علیہ قبیلے والا جس نے نصف صدی تک قبیلے کا بے شمار ونگلوں، عربوں اور میلوں کی رونق بڑھا، قبیلے کی حالت طویل علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ ایک

وچسپ پہلو یہ ہے کہ سنا جاتا ہے اس نے اپنی زندگی بھری رفیق نئی اپنے بیٹھے یا کسی دوست کو نہیں دی تھی کسی خاص شخص کو بلکہ اس کے حوالے کی تھی جو نرس ڈیوٹی پر تھی اس نے ہمارے ٹائٹلے کو بتایا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا حضور ہے جسے علیا نے اپنی نئی دی تھی مگر اسے بالکل نہیں جانتی:

اس نے اخبار تہہ کر کے میز پر پھینک دیا یہ اخبار دالے بھی عجیب ہوتے ہیں ہر طرح کو خواہ مخواہ منہنی خیر بنا دیتے ہیں: وہ اپنے کمرے سے نکل کر خواب گاہ کی طرف جانے لگا کہ ٹن ٹن ٹن کی آواز آنے لگی۔

”یہ نئی کون بجا رہی ہے آواز وہ ڈرامائیگ دوم کے دوازے پر پہنچ گیا۔
چند خواتین وہ گئی تھیں جن کی گھاٹیاں انہیں لے جانے کے لئے ابھی تک پہنچی نہیں تھیں۔
اس نے دیکھا کہ نئی اس کے ماموں کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔
”بھائی جان! آپ تو خواب نہیں دے سکیں۔ آپ بتائیں گے؟“ اس نے پوچھا
”کیا بتاؤں؟“

”بھائی جان! علیا نے اپنی نئی آپ کو کیوں دی ہے کیا آپ اس کے دوست رہ چکے ہیں؟“
”نہیں۔ میں کبھی اس کا دوست نہیں رہا تھا۔“
”پھر اپنی نئی اس نے مرتے وقت آپ کو کیوں دی؟“ وہ نے سوال کیا۔
”کیا بتاؤں۔ میں نے اس کے ساتھ ایک بہت معمولی قسم کی ہمدردی کی تھی۔ بھلا کسی بیدارے کو اپنی مافی پلانا بھی کوئی بڑا احسان ہوتا ہے۔ اس نے اسے بڑا احسان سمجھ لیا۔“
”اچھا؟“
”... تو اور کیا؟“

”اس سے لڑن کی آواز آئی اور خواتین اپنے سروں پر دوپٹے درست کر کے بھاگنے لگیں چشتی نے نئی کراٹھ لیا اور اسے اپنے کمرے کی الارمی میں رکھ دیا۔“

صبح بیٹھنے کے بعد وہ اخبار دیکھ کر ہلکا سا ہنسا کہ اس کی نظر ایک عنوان پر پڑی تھی۔ عنوان تھا۔
 علیائی دالہ اور ابتدائی مطر تھی۔ اب وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ہے جو گذشتہ نصف
 صدی سے گونجتی رہی تھی۔

چشتی کی آنکھوں میں سکواہٹ تیرنے لگی۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دی: ”رضیہ! رضیہ!...!!“
 رضیہ جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی، شوہر کی آواز سن کر تیزی سے
 آگئی۔ کیلے...؟

”رضیہ! ایک عجیب معاملہ ہو گیا ہے۔ میں تو اب سمجھا ہوں کہ علیائی دالہ ایک بڑا آدمی تھا۔
 دیکھو اس پر پورا پھر چھلے۔ دیکھو تو...“ اور یہ کہتے ہوئے چشتی نے اخبار بیوی کے ہاتھ میں
 دے دیا۔ رضیہ اخبار دیکھنے لگی۔

”ارے!“

”کیا ہوا؟ چشتی کے منہ سے نکلا۔

”آپ نے پھر کیا یہ حصہ نہیں دیکھا اور وہ پڑھنے لگی: یہ بات ابھی تک ایک سماج کے
 علیائے اپنی عمر بھر کی رفیق تھی کس کے حوالے کی تھی؟ ہسپتال میں وہ کون اجنبی آیا تھا جو اس
 سے ٹکے کر چلا گیا تھا؟ حالانکہ علیا کا اپنا بیٹا بھی ہے اور اس کے احباب بھی بہت بڑی
 تعداد میں موجود ہیں۔ امید ہے چند منگ یہ معاملہ ہو جائے گا۔ چار نامہ نگار یہ معاملہ کرنے میں
 بڑی تگ و دو کر رہے۔ رضیہ نے اخبار کے صفحے سے نظریں ہٹائیں چشتی کی آنکھوں سے
 حیرت و استعجاب کی سکواہٹ غائب ہو گئی۔

”میں کہتا ہوں ان اخبار والوں کو اس موقع خدا دے گا۔“

”لیکن آپ کیوں ٹکر کرتے ہیں۔ کرنے دیں ان لوگوں کو جگ و دو۔ جب مسئلہ حل ہو گا تو
 رضیہ ہنسنے لگی۔ ”کھو دا پہاڑ اور نکلی جھریا اور وہ بھی۔“

”یہ تو ہو گا ہی۔ چشتی نے مسکرا کر بیوی کی بات کی تائید کی۔

ساڑھے سات بجے وہ اپنے دوست رحمت خاں کے گھر کے دروازے پر کال بیل پر انگلی رکھے کھڑا تھا۔

”کیسے چشتی صاحب! رحمت نے کسی حد حیرت کے عالم میں اس کا غیر مقدم کیا کیونکہ چشتی اس سے پہلے کبھی اتنے سیرے اس کے ہاں نہیں آ رہا تھا۔ ”آندرا جلیے“ رحمت اسے کمرے میں لے گیا۔ ”آشتہ فوطہ کمرے لگے تا رحمت نے ٹکٹا پوچھا۔

”نہیں خاں صاحب! ناشہ کر کے آیا ہوں، کوئی نئی تازہ خبر!“

”اجاب دیکھتا ہے۔ میں الا فوائی قسم کی تو کوئی خاص خبر نہیں؟“

”اور اپنے ملک کی خبر! — — —“

یہ لفظ سن کر رحمت خاں ہنس پڑا۔ ”دیکھتا ہے۔ لکھنے والے نے قتلے جانے والے واقعے

کو ایک سنا بنا دیا ہے؟“

”دیکھ لیں چار اکال!“

رحمت خاں چشتی کے اس فقرے پر بھونچکا سا ہو گیا: ”اس میں آپ کا کمال کیسا ہے؟“

”وہ آئی اس خاکساری کو قوی گئی تھی!“

رحمت خاں کو بہت حیرت ہوئی اور چشتی اس کی اس حیرت پر مسکاتے لگا۔

”مگر چشتی صاحب آپ کا علیا سے کیا واسطہ؟“

بظاہر کوئی واسطہ نہیں۔ میں کہاں، وہ کہاں بس ایک جھوٹا سارا تھہرا تھا کئی سال

پہلے۔ اور چشتی نے اسے پوری دوا دلائی۔

”اسے کہتے ہیں رائی کا پھاڑ بنانا، رحمت خاں نے کہا: ”اور ہاں ایک مشودہ بگلا ہے؟“

”مشودہ کیا ہے رحمت خاں؟“

”مشودہ صرف یہ ہے کہ ابھی یہ بات کسی کو بتائی نہیں دیکھتے ہوتا کیا ہے؟“ رحمت خاں نے

سرگوشی کی وہ رحمت خاں کے ہاں آدھ گھنٹہ بیٹھا اور اس دوران میں علیا قتلے کے علاوہ

اور کسی موضوع پر بہت کم گفتگو ہوئی اور جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف چلا تو ٹکڑی کا وہ ایک سایہ سا جو اس کے ذہن پر محیط ہو گیا تھا اب دور ہو چکا تھا۔

دوسرے روز چشتی نے اخبار ایک ترقیع کے ساتھ اٹھایا۔ اس میں علیا ثقی دلا کے متعلق کوئی خبر کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پانچ روز بیت گئے۔ چشتی وقت گزاری کے لئے جاسوسی ناول کے مطالعے میں مصروف تھا کہ کال بیل بجی اور دو تین منٹ بعد راجو نے آکر بتایا صاحب! ایک آدمی آیا ہے؟

”کون آدمی؟“

”پتا نہیں جی کون ہے؟“

”اچھا۔ بھلاؤ اسے آتا ہوں۔“

چشتی نے ناول بند کر کے میز پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے ڈرائنگ روم کی طرف چلا۔ ایک صاحب جن کی عمر تیس بیس برس ہوگی کوچ پر بیٹھے تھے۔ چشتی کو دیکھ کر تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

”تشریف رکھیے جناب۔“ وہ صاحب بیٹھ گئے۔ بیگ کھول کر انہوں نے اپنا ڈرائنگ کارڈ نکالا اور چشتی کے سامنے رکھ دیا۔ چشتی نے پڑھا۔ یہ ایک مصروف روزنامے کے نمائندہ خصوصی تھے۔ ”میں معافی کا خواستگار ہوں۔ زحمت دے رہا ہوں۔ میرا نام زیر علی انصاری ہے جیسا کہ آپ نے کارڈ میں ملاحظہ فرمایا ہو گا۔“

”جی ہاں آپ غلط تفہیم ہو چکا ہے۔ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ انصاری نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں سے اخبار نکالا۔ اس میں ایک فخر چھپا تھا۔ علیا ثقی دالا کے بارے میں — لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔ اخبار کے سارے سرچے انہوں نے اچھے نکل گئے ہیں۔“ انصاری یہ لفظ کہہ کر اپنے نعرے کے مدخل کا انتظار کرنے لگا۔

”بہت خوب؟“ چشتی نے کہا۔ انصاری کی آنکھیں پلکنے لگیں۔

چشتی صاحب! یہ نہ بوجھے آپ کی تلاش میں کیسے کیسے ہفت خواں ملے کرنے پڑے۔
ہسپتال والوں نے تو کورا جواب دے دیا کہ ہمیں اس آدمی کا کوئی علم نہیں جسے علیا نے ٹی دی
تھی مگر جناب! اخبار ملے بھی بڑی جلد ہوتے ہیں۔

”اس میں کیا شک ہے؟ انصاری صاحب کی آنکھوں کی چمک دگنی ہو گئی۔

”دیکھ لیجئے آپ کے اہل بدبخت کیا کس طرح پہنچا یہ ایک الگ رد واد ہے۔ بہر حال۔۔۔

جی۔ دیکھ لیا ہے۔ آپ کو میرا پتا کس نے بتایا؟“ چشتی نے پوچھا۔

”صاف کہنے یہ راز کی باتیں ہیں!۔۔۔ کہی نہیں جاسکتیں۔ نامہ نگار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ کو رحمت خاں نے بتایا ہے۔“

”نہیں ہے یہ بات درست ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ ہمیں اطلاع عنایتی موصول ہو گئی۔ آج اس مسئلے میں انڈیلو کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ نامہ نگار
درا شہر بھر بولا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ علیا سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟“ چشتی نے دروازے کی طرف

منحرف کر کے ذرا بلند آواز سے ”چلتے بھلیاٹے“ کہا اور اخبار کے نامہ نگار سے مخاطب ہو کر بولا۔

”صاحب، تعلقات کیسے تھے اور کیسے نہیں تھے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ علیا کے ساتھ

میرے تعلقات تھے ہی نہیں؟“

”تعلقات نہیں تھے۔۔۔ تو پھر۔۔۔“

”آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے ہسپتال میں بلا کر اپنی ٹی کیوں دی؟“

”جی ہاں؟“

”میں دے دی۔ اس کا جی چاہا دے دی۔ آپ کو یا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ چشتی

نے اپنی طرف سے خوشگوار مڑ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جی! اعتراض کیا ہو سکتا ہے لیکن آپ کو جو ترجیح دی تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی؟“

”ہوگی ضرور ہوگی صاحب!“

نامہ نگار نے پہلی سرحد اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھا چشتی نے اسے کلکیوں سے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور اس کا کوئی فزٹس نہ لیا۔

”ایک اور سوال ہے چشتی صاحب؟“

”انشاء۔“

”آپ کے نزدیک اس تاریخی ٹی کا معنی کیا ہے میری مراد ہے آپ اس کا کیا کریں گے؟“
چشتی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی اس پہل پر تو خود کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔
”آپ کہتے ہیں یہ تاریخی ٹی ہے“ چشتی نے اپنا فقرہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ نامہ نگار جھٹ بول اٹھا۔

”تاریخی ٹی نہیں تو اور کیا ہے پچاس برس تک اس نے اپنے ایک کا ساتھ دیا ہے سنا گیا ہے کہ علیا اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔“

”انصاری صاحب؟“

”فریائے بندہ پرور!“

”فرض کیا یہ ٹی آپ کو مل جاتی تو — چشتی نے اپنی طرف سے نامہ نگار کو آناٹش میں ڈال دیا تھا۔

انصاری نے دو چالھے خود کرنے کے بعد جواب دیا: ”آپ پہنچنا چاہتے ہیں کہ میں کیا کرتا۔ میں اسے نوادر میں شامل کرتا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر میں کئی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں میں نوادر جمع کر رکھے ہیں۔ کبھی کبھی ان نوادر کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ شائقین دُور دُور سے آکر انہیں دیکھتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے بارے میں مضامین لکھے جاتے ہیں۔ بڑی شہرت ہوتی ہے ان کی!“

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“ چشتی نے بلا تکلف اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔

راجہ چلے لے آیا اور بڑے خوشگوار احوال میں چائے پی جانے لگی۔

نامہ نگار کے جانے کے بعد چشتی نے نامہ نگار سے اپنی ملاقات کی دودا اور ہنس ہنس کے اپنی بیوی کو ننادی مگر رخصت ہنسی میں اس کا ساتھ دے سکی۔

شام کے سات بجے ہوں گے۔ چشتی اپنی بیوی کے ساتھ ٹیلیوژن دیکھ رہا تھا اور راجہ کی بیوی جو باہرچی خانے میں بہت قریب سے المادی میں دکھ رہی تھی، اس نے کال بیل سن لی۔ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ دو شخص کھڑے ہیں۔

”چشتی صاحب تشریف رکھتے ہیں، ایک نے پوچھا۔

”دیکھ کر بتاتی ہوں: اور ڈرائنگ روم میں آکر اس نے ان دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع

دی۔

”بلا لاؤ: چشتی نے کہا۔

رخصتہ چکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چشتی نے ٹیلیوژن بند کر دیا۔ چمنٹ بعد آگئے۔

”سلام علیکم چشتی صاحب! دونوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔

چشتی نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگایا کہ یہ بھی کس اخبار ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ ایک

کے دائیں ٹٹلے پر کمرہ لٹک رہا تھا۔

”فرمائیے کیا حکم ہے؟ چشتی نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔ ہم اپنا تعارف کرا دیں، ہم اخبار شش جہت کی طرف سے آئے ہیں، آپ کو ایک

تصویر دینا چاہتے ہیں۔ اس معاملے پر ایک نقاب پڑی ہے، جس توقع ہے کہ آپ یہ نقاب

سٹاروہ گے یعنی ہمیں صحیح بتا دیں گے کہ کئی کا واقعہ کیلئے۔ کیوں طیلانے...؟

چشتی کو ذرا غصہ آگیا: اگر آپ اسے ایک راز سمجھتے ہیں تو راز ہی رہے ہیں۔ اور کچھ فرمائیے۔

چشتی کے یہ الفاظ سن کر دونوں نمائندے ایک دوسرے کو سنی خیر نظروں سے دیکھنے لگے۔

”چشتی صاحب! اگر دونوں کو حقیقت حال کا علم نہیں ہو گا تو وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔

ایک بولا۔

”بنائے رہجئے۔“ چشتی کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”آپ کی مرضی۔ ہم آپ کو معذور نہیں کر سکتے۔ کیا وہ مشہور و معروف فقی و کھانکے ہیں؟“ دوسرے نے کہا۔

چشتی اٹھ بیٹھا۔ دونٹ بعد واپس آیا تو فقی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ اچانک فضا میں روشنی کی ایک جھلک سی ہوئی اور ایک سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔

”بس شکریہ چشتی صاحب! دونوں صوفیوں سے اٹھ بیٹھے

چلے آ رہے ہیں؟“ چشتی نے انہیں دو کتے کی کوشش کی۔

”پھر کبھی ہوں؟“ وہ دونوں چلے گئے اور چشتی بھی اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کا موڑ

غراب ہو گیا تھا اور اس وقت فقی کے باڑے میں ایک لمبے کے لئے بھی سوچا نہیں چاہتا تھا،

کمرے میں جا کر آرام کر لی میں وحش گیا۔ وہ جب سے ریٹائر ہوا تھا، ہندو میں روز کے بعد اپنے

ٹھکے میں چلا جاتا تھا۔ اس کے کچھ وہ پرانے رفیق حین کی دو دو تین تین سال میں بار بار ملازمت ہوتی

وہ گئی تھی بڑی محبت سے اس کا بغیر عدم کرتے تھے اور چشتی دیر تک ان کے ساتھ مختلف ہوشیار

پر باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوستوں کی صحبت میں گزری ہوئی یہ گھڑیاں اسے بہت عزیز تھیں۔ انہی

نمائندوں سے ملاقات کرنے کے بعد وہ اپنے ٹھکے میں جا رہا تھا اس کا پہلا دوست

ارشاد کمرے کے باہر ہی مل گیا۔ ارشاد کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مگر اسے ایک برس کی

تفریح مل گئی تھی چشتی کالے ٹکلف دوست تھا اسے دیکھتے ہی بولا: ”آئیے فقی والے چشتی صاحب!

چشتی نے ارشاد کی کسی بے تکلفی کا بڑا انہیں دانا تھا مگر اس کے یہ الفاظ اسے بڑے لگے اور غلاب

محول اس نے تلخ ہنس میں پوچھا: کیا مطلب ہے تمہارا؟“ چشتی کے ہنس میں مدہوشی تھی لیکن

ارشاد نے اسے محسوس نہ کیا۔

”مطلب کیا ہو سکتا ہے اس کا ایک تھا وہ علیا فقی والا اور ایک ہے ہمارا چشتی فقی والا۔“

ارشاد برابر سکرانے چلا رہا تھا۔

”بڑی لمبے ہمدہ بات کہہ رہے ہو ارشاد! چشتی کا لہجہ اور تلخ ہو گیا تھا۔

ارشاد کو اب محسوس ہوا کہ اس کے دوست کا سوڑ خراب ہو گیا تھا۔

”آؤ کنیشن چلتے ہیں، غمور، رفعت اور ظہیر سب وہیں بیٹھے ہیں۔“

ارشاد نے چشتی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنیشن میں لے آیا۔ غمور، رفعت، ظہیر نے فوراً اٹھ کر اسے گھیرے میں لے لیا۔

”چشتی یار! کیا ریٹائرمنٹ کے بعد ملٹی بیجانی شروع کر دی ہے؟“ غمور بولا۔

”ویسے ملٹی تمہارے ہاتھوں میں بجتی خوب ہے! رفعت بولا اور ہنسنے لگا۔

”چشتی سبجانی! میں سوچ رہا ہوں ریٹائرمنٹ کے بعد میں ڈھول بجایا کروں گا۔ ملٹی دالان تو

بل ہی گلیبے!“

چشتی کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا وہ ضبط نہ کر سکا تھا اس کا مطلب کیا ہے؟

اس نے خشکی سے کہا۔

ارشاد کے سوا باقی تمام دوست جبرست سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ارشاد کو نظر پر گیا جو

صاحب کو نظر پر تھے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے یمنی دروازہ کھولی اور ایک تہہ کیا ہوا اخبار

ارشاد کے ہاتھ پہنکے دیا۔ ارشاد وہاں سے کڑیا اس نے اخبار کا صفحہ کھولا اور اسے چشتی کے آگے پھیلا

دیا۔ اخبار کے اس صفحے پر چشتی کو ہاتھ میں ملٹی لے ایک کوچ پر دکھایا گیا تھا اور نیچے یہ سطر

درج تھی!

”رولوے کے سابق اسٹریٹ نامر علی چشتی اعلیٰ درجہ راز ملٹی کے ساتھ جو انہیں حلیائی دالے نے

نا معلوم درجہ سے دی تھی؟“

چشتی کے قن بدن میں ناگ ہی تو لگ گئی۔ ان لوگوں کا یہ حوصلہ۔ یہ کیا کچھ اس لکھ دی ہے؟

اس نے اخبار پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہ توپ جانیں: محمود نے کہا۔

”چشتی صاحب: کچھ اور بھی معلوم ہے۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ: ظہیر یہ کہہ کر نگلیں
سے چشتی کے چہرے پر اپنی بات کا وہ عمل تلاش کرنے لگا۔
”کیا لکھا ہے؟“

”اس نے لکھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد چشتی صاحب نے نوادر جمع کرنے کا کام شروع
کر دیا ہے۔ اور یہ نئی ڈھڑی بھاری قیمت پر نوادر کے کسی ساتھی کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔
ظہیر بڑا لگا یہ خبر پر سول کے اخبار میں تھی ماخوذ میرے گھر میں ہے۔
”کہو اس، لغو پہل: چشتی کی آنکھوں سے شرار سے نکلتے گئے۔

ارشاد نے اندازہ لگایا کہ اس گفتگو کو آگے بڑھایا گیا تو مزید تلخی پیدا ہو جائے گی۔ وہ چشتی
کا ہاتھ پکڑ کر اسے کینٹین سے باہر لے گیا۔

”چھوڑو یاد! یہ بھی کوئی شخصہ کرنے کی بات ہے۔ وہ نئی قمیض بھلا پاس کیوں رکھ چھوڑی ہے؟
”تو کیا کروں؟“

”کیا کرو۔ اس مسئلے پر سوچنا چاہیئے۔“

چشتی گھر پہنچا تو اس کا مڑا بہت خراب تھا اور جب جوی نے اسے بتایا کہ اس کی فریج بھگی
میں ایک اخباری رپورٹ آیا تھا تو وہ گرج کر بولا: ”سری مجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کس
معیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں ان بد معاشوں پر کیس کر دوں گا۔ جولوہ خواہ ایک شریف اللہ
سور کوئی کہہ رہا ہے۔“ وہ فیصلہ اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور گھر کے کاموں میں
معمول رہی۔ وہ گھنٹے بعد وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور بولی: ”دیکھئے یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔
”تو کس طرح ہوگا؟“ رضید قرین منٹ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی: ”اس نئی کامائز تھی وہ
عطیا کا بیلبے۔“

چشتی کو احساس ہو گیا کہ اس کی جوی کوئی معقول تجویز بتانے والی ہے۔ تو پھر اس نے

سوال کیا۔

”حق، حق داری کو ملنا چاہیئے۔ ہم بھی اس مصیبت سے نجات پائیں گے۔
جنتی کو احساس ہو گیا کہ جس تجویز کو وہ معقول سمجھ رہا تھا وہ اتنی معقول نہیں تھی۔
رضیہ تم اس بات کو بھول گئیں کہ علیا کو اپنے بیٹے پر اعتماد نہیں تھا۔ ہر اسم نے بتایا تھا کہ
اس کا بیٹا منظور ابڑی صحبت میں خراب ہو گیا ہے۔ کیوں میں بڑا رہتا ہے؟
”یہ سب کچھ آپ مجھے بتا چکے ہیں۔ مگر میں اس مصیبت سے اسی صحت میں نجات ل سکتی
ہے کہ نفی علیا کے بیٹے کے حوالے کر دیں۔

یہ اچلو والے ہیں جسے نہیں دیں گے کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑتے وہیں گئے۔
جنتی اور رضیہ دو رنگ اس موضوع پر غور کرتے رہے۔ آخر طے پایا کہ جنتی منظور سے کو
ٹھوٹے گا۔ وہ شہر کے کسی نہ کسی ٹکے میں غور دل جلائے گا۔ دوسرے دن سے جنتی نے اپنی ہم
کا آغاز کر دیا۔ ٹکے میں جانا اسے بڑا عجیب لگا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کسی ٹکے کے قریب
سے بھی نہیں گزرا تھا۔

وہ ایک ٹکے میں پہنچا اور ابھی اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا کہ
اسے یوں غسوس ہوا جیسے بدبو سے اس کا داغ چھٹ جائے گا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ
وہاں بیٹھے تھے وہ بڑی عجیب نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں وہ باہر نکل کر آگھر آکر
اس نے یہ فریضہ راجو کے سپرد کر دیا۔ راجو ہر روز دو تین گھنٹے آگھر سے باہر آوارہ گردی کرتا تھا۔
ابھرا پس آکر بتاتا تھا۔ صاب جی منظور انامی کوئی آدمی نہیں ملا۔

چار دن بعد وہ خبر دیا۔ منظور ابلی گیا ہے۔ صاب جی؟

”کہاں ہے؟“

”ایک ٹکے میں۔ پر آپ اسے دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ بڑی خراب حالت ہے اس کی۔
جنتی اسی وقت راجو کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

موجی دروازے کے اندر ایک کچے کی پٹنی پرانی چٹائی کے اوپر پٹریوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جسے راجو نے منظور اکبر کو دکھا کر تودہ اسے نکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ چشتی اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے گیا۔

وہ بھی یہی باتیں کرتا تھا چشتی نے سلب بھاکر جب اسے ہوش پائے تب فنی اس کے حوالے کر دے۔ دوسرے روز صبح نو بجے اس کی حالت میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی۔ باپ کی موت کا ذکر سن کر زار و قطار رونے لگا۔ بڑی شکل سے چشتی نے اسے نالختہ کر دیا اور فنی اس کے حوالے کر دی۔ منظور اسے فنی کو کئی بار چمکا، اور چلا گیا۔

اسی وقت چشتی نے ایک خبر بیان علیا کی فنی اس کے بیٹے منظور کو دے دی گئی ہے اب نامرطی چشتی کو فنی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

فنی گھر سے چلی گئی تو چشتی کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک کانا بوا اس کے ذہن میں جھومنا تھا۔ وہ دور ہو گیا ہے۔

اس نے جو خبر اخباروں کو بھیجی تھی وہ چھپ گئی تھی اب اس نے پھر اپنے روزمرہ ممولات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا لمبی لمبی سیریں کرتا تھا اور پرانے دوستوں کے ہاں بے ٹکری کے عالم میں گنگر کرتا تھا۔

اسی عالم میں تین ہفتے گزر گئے۔

اس روز اور وہ دن اتوار کا تھا جب وہ شام کے قریب اپنے ایک دوست کے بچے کی سالگرہ میں شامل ہونے کے بعد گھر واپس آیا، اور جیسے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچا، اس کی آنکھوں تلے ایک شعلہ سا لہرا اٹھا۔ فنی چٹائی کے اوپر پڑی تھی۔ رضیہ! رضیہ! وہ چھٹا۔ رضیہ بھاگی آئی۔ کیا ہوا؟

”یہ کیا ہے کیا مصیبت ہے؟“ اس نے فنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”وہ منظور!۔۔۔“ فریاد ہے ٹھیکے میں۔ اس نے مصیبت کی تھی کوئی آپ کے ہاں پہنچا دی

جائے۔ نیکے دالے دے گئے ہیں۔ میں کیا کرتی؟

چشتی گر جنے نکلا: مگر تم کے بکوں لے لی۔ واپس کر دینا — کہہ دینا ہمارے گھر
میں نہیں رہے گی۔ تم کو پتا نہیں تھا کہ اخبار دالے جان نہیں چھوڑیں گے؟

رضیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راجہ دودھ دانے کے اندر آیا: صاحب جی — وہ آئے ہیں جی

— وہی جی۔ اخبار دالے

”کیا؟“ اور چشتی دونوں ہاتھ پیشوں پر رکھ کر صوفے میں گر پڑا۔

اس کی خاطر

چند روز پہلے میرے ایک دوست نے یہ واقعہ سنایا تھا اور آج میں اسے اپنے الفاظ میں منسلک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرے دوست نے کہا تھا۔

ساڑھے ستائیس برس تک صبح سے لے کر شام تک کام کرنے کے بعد میں بڑی طرح تھک گیا اور محسوس کرنے لگا کہ بقول مرزا غالب "اب عناصر میں اعتدال کہاں؟ سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ پہلے اکبری دروازے سے مکان دوڑ کر سائیکل چلا کر آئی تکلیف" بات نہیں تھی لیکن جب میری کمپنی نے مکان دوڑ سے گلبرگ میں اپنا دفتر منتقل کر لیا تو ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ دفتر چھوڑ دو اور جو رقم دفتر سے لے کر اس سے کوئی کاروبار کر دو گوارے کی ابھی صورت نکل آئے گی۔ میں بھی اس کے لئے تیار ہو گیا مگر کمپنی کا جیئر مین مجھے جیسے تجربہ کار ڈرائیور سے عزم ہونا پسند نہیں کرتا تھا اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری پرانی خدمات کا ذکر کیا تو خواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر کے یہ رعایت بھی دے دی کہ اگر تم جاہلو تو کمپنی تمہیں کلر خریدنے کے لئے مناسب رقم بلا سو مرض دے سکتی ہے جسے تم آسان قسطوں میں لٹا دیتا۔

یہ کوئی خاص سہولت نہیں تھی مگر اس وقت ایک بڑی رحمت محسوس ہوئی۔ سوچا ساری عمر ٹانگوں کو گھولنا ہے اب ذرا کار گھما کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا راحت ملتی ہے۔ میرے ایک دور کے عزیز ہیں پیٹھ کے لحاظ سے ٹھیکیدار ہیں۔ انہوں نے ٹھیکیداری میں

خانہ کم اور نقصان زیادہ اٹھایا تھا لیکن جب ان کے دوڑے بیٹے دوہئی میں بہ سلسلہ ذات چلے گئے تو گلیا پیسے کی بارش ہونے لگی اب تو یہاں بیوی پرانی بیوی اپنی شان سے کم تر خیال کرنے لگے۔ چنانچہ پرانے ماڈل کی ڈائمنڈ کاڈ نظروں سے گر گئی۔ نئی ڈیٹ خرید لی پرانی کار کا ویرہ منقول تھا۔ انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ بچے میری کمپنی کا خریدنے کے لئے معقول رقم دینے پر آمادہ ہے فوراً غریب جانے پر تشریف لائے اور بڑے پچاس ہزار کا مال ہے۔ تیس ہزار میں جا کر ہے لے لو بعد میں دیکھتا دوں گے۔ میں بعد میں پچھتاؤ نہیں چاہتا تھا۔ کمپنی کے چیرمین سے گفتگو کر کے مطلوبہ رقم ان صاحب کے حوالے کر دی اور گاڑی خرید لی

گاڑی آگئی۔ میں نے زندگی بھر سائیکل چلائی ہے۔ گاڑی کا تو کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی آئی تو ڈرائیور کو بھی آنا چاہیے تھا۔ گاڑی والے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے سود کی اور ہر دو ذائقہ نے ڈرائیور کا انٹرویو ہونے لگا معلوم ہوا کہ یہ لوگ بڑے لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیور کرتے رہے ہیں۔ چھوٹی رقم ان کی نظروں میں نہیں آتی تھی اور ادھر میری یہ محبوبی کہ اگر آدمی تنخواہ ڈرائیور ہی کو دے دوں تو گاڑی کی قسط اور گھر کے اخراجات کے لئے مدد دے کہاں سے لادوں۔

گاڑی جتنی آسانی سے سیر ہوئی تھی۔ ڈرائیور کا حصول اسی قدر مشکل ہو گیا۔ سوچا خود ہی کوشش کر کے ڈرائیورنگ سیکھ لوں مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ پہلے دن ہی پسینہ پسینہ ہو گیا اور یہ بھی انکشاف ہوا کہ طریل اور سخت محنت لے مجھے اعصابی مرض بھی بنا رہا ہے۔ ایک اعصابی مریض کے لئے کار ڈرائیورنگ خطرے سے خالی نہیں بس ڈرائیورنگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھا اور ایک بار پھر ڈرائیور کے لئے کوشش کرنے لگا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ایک اچھے ڈریل ڈول کا آدمی دروازے پر آکر بولا۔ صاحب جی ! آپ کو ڈرائیور چاہیے۔ میرا نام حسن ہے آپ کو جو چاہیے فتح محمد نے بتایا ہو گا کہ میں کیسا ڈرائیور ہوں۔ مجھ سے کسی فتح محمد نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تاہم میں مصلحتاً خاموش رہا۔

چاہتا تھا کہ یہ اگر مناسب تنخواہ مانگے تو اسے رکھ لیں۔

اس کے جتنے پر ایک نگاہ ڈالی۔ تو نا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ عمر پینتیس سال سے کم کیا ہوگی
ٹھوڑی برباشت بھر داڑھی آ نکلیں چھوٹی چھوٹی۔ رنگ زرد، کال پچکے ہوئے، پیشانی خراخراہیلی
نظر ہی میں بتا چل گیا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ نہ جانے کن کن
تسلخ تجربات سے گزر چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔

”تیس ڈرا میٹرنگ کا کتنا تجربہ ہے؟“

اس نے سوال سنتے ہی کئی ایسے صاحبوں کے نام گنوا دیئے جن کی گاڑیاں ڈرائیو کر چکا تھا۔
”میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ تنخواہ کیا مانگے؟“

”جو بھی آپ خوشی سے دے دیں۔“

یہ فقرہ خطر سے خالی نہیں تھا نہ جانے کیا مانگ بیٹھے۔ مگر چونکہ اس نے تنخواہ کے بارے میں
کسی بڑے آدمی کے ڈرائیو کی طرح گفتگو نہیں کی تھی۔ اس لئے میں نے کہہ ناکل سے کام شروع کر دیا
تنخواہ کا فیصلہ ہو جانے لگا:

اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ بے اختیار مصافحے
کے لئے اس کے ہاتھ میری طرف بڑھ گئے۔ مگر مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ وہ لوکر تھا۔ لوکر،
اپنے مانگ سے مصافحہ نہیں کرتا۔ تاہم میں نے مصافحہ کے اسے رخصت کر دیا۔

جس روز اس نے گاڑی ٹارٹ کی میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

میں نے اپنی طرف سے بڑی کم تنخواہ بتائی اور وہ بھی اس نے قبول کر لی اس پر میں پریشان
ہو گیا کہ کیسے نا تجربہ کاری کی وجہ سے کوئی ایسی ڈنٹ نہ کر دے۔ ہی چاہا کہ دونوں حصے دینے بھرکی
تنخواہ لو اور چھٹی کر دے۔ لیکن نہ جانے کیوں احساس ہونے لگا کہ اسے میری اس بات سے
بڑا دکھ ہو گا اس لئے اس سے کچھ نہ کہا۔

دن پر دن گزرتے گئے اور وہ باتا عہدہ طور پر میرا ڈرائیوڈ بن گیا۔

صحن کی ایک بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس سے جو کچھ بھی کہا جاتا تھا بڑی بھرتی سے کر دیتا تھا۔ گھر سے آتے ہی کار صاف کرنا تھا۔ بڑی اچھی طرح اس کا جائزہ لیتا تھا کہ کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ میں ناشتہ کر کے دروازے ہی پر ہوتا تھا کہ وہ جھٹ اپنی سیٹ پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کی یہ بھرتی دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی د جانے پر خیال کیوں آ جاتا تھا کہ وہ اتنا پھر تپلا ہے نہیں صرف مجھے خوش کرنے کے لئے تیزی دکھاتا ہے۔

میری کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے مالک سمجھتا رہے اور خود کو نوکر مگر یہ سلسلہ دیر تک چل نہ سکا۔ ایک روز جب اس نے مجھے اپنے حالات بتائے تو وہ مسخروں کی طرح ہنس دیا۔
 ”کھڑی تھی گر گئی۔“

اس نے بتایا۔ صاب جی! میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے مگر میں صرف ایک بہن ہے۔
 ”اور کوئی نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں صاب جی! اور کوئی نہیں۔ صاب جی! کلثوم مجھ سے گیارہ برس چھوٹی ہے۔ کسی اچھے گھر میں ہوتی تو اب تک اس کا بیاہ ہو چکا ہوتا۔“
 ”تو تم نے اس کا بیاہ کیوں نہیں کیا؟“

”جی مرنے کی ذات بھلا کیا کر سکتی ہے۔ یہ کام ماضی کرتی ہیں۔ اس کی ماں نہیں ہے۔“

اس دن بس اتنی ہی گفتگو ہوئی میں نے عسری کیا کہ وہ کچھ اور کہتا چاہتا ہے لیکن کہ نہیں سکا۔ صحن اپنی ڈروٹی بڑی مستعدی کے ساتھ پوری کرتا رہا۔ مجھے اس سے کسی قسم کی شکایت نہ پہلی وہ افراد کو بھی آ جاتا تھا اور پوچھتا تھا کہ کیوں صاب جی آپ کو کہیں باہر تو نہیں جانا مگر میں جتنی کے روز بچوں ہی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہوں کہیں بھی جانا آتا نہیں ہوں۔

ایک اور بار وہ اس طرح آ گیا تو میں نے کہا۔

”دیکھو صحن! جب میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ افراد کو مت آیا کرو۔ پھر آج کیوں آ گئے ہو؟“

یوں نگاہ نہ کھڑے ہوئے بچکپار رہے۔
 "کیوں حسن! کچھ کہنا چاہتے ہو۔ تنخواہ بڑی چاہیئے؟"
 "جی نہیں۔"

"پھر کیا معاملہ ہے؟"

وہ دو تین منٹ گھاڑی کے ارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر بڑی عجلت سے بولا۔
 "صاحب جی! بہن کی بڑی جتنی داری ہے مجھ پر۔
 میں نے مجھ بیکار وہ بہن کی شادی کے لئے رقم مانگنا ہے۔ میں خود قرض میں جکڑا ہوا تھا
 اس کی کیا مدد کرتا۔"

"حسن! میں نے کہا۔ میں نے تم کو بتایا نہیں تھا کہ یہ گھاڑی کہنی کے پیسے سے خریدی تھی
 اور میں ہر ماہ اس کی قسط دیتا ہوں۔ گھر کے اخراجات الگ ہیں۔"
 "صاحب جی! میں ادھار کب مانگتا ہوں؟ وہ بے تابی سے بولا۔
 "ادھار نہیں مانگئے تو کیا چاہتے ہو۔؟"

اس نے ذک رک کر اپنا عندیہ واضح کر دیا۔ اصل میں اسے بہن کے لئے مناسب دستہ
 ڈھونڈنے میں بڑی وقت پیش آرہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ کام عورتوں کے ہوتے
 ہیں۔ مردوں کے نہیں۔ اور وہ چاہتا تھا کہ میری بیوی اس مسئلے میں اس کی مدد کرے اور
 کوئی موزوں بڑوٹھونڈ دے۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔"

میں نے اسے تسلی دی ماس نے میری بیوی کو بھی آگاہ کر لیا کہ وہ کوئی مناسب بڑوٹھونڈ
 دے گی۔

کام کی حریفیت میں میں اس کی درخواست بھول گیا سات دو روز گزرے ہوں گے کہ وہ
 پھر چٹنی کے دن آگیا۔

صاحب جی! کچھ کیا ہے آپ نے؟ اس نے آتے ہی سوال کیا۔
مجھے سخت غصہ آیا۔ کیا الحق انسان ہے۔ بڑھوٹا کوئی مذاق ہے۔ آٹھ دن میں کیسے
رشتے کی بات چل سکتی ہے؟

حسن: پاگل ہو گئے ہو تم؟ اتنی جلدی کیا ہو سکتی ہے؟ صبر سے کام لو۔

پر صاحب جی! وہ۔۔۔ صاحب جی! مجبوری ہے نا۔

مجبوری کیا ہے؟ مجھے اس کی بات پر سخت غصہ آ گیا۔

وہ خاموش رہا اور اس کی صورت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر کوئی ہتھکنڈ چا رہی ہے۔

مجھے اپنے پیچھے پراسوس ہوئے دکھائے گئے اور اس لئے ڈراؤنی ہے کہ۔

حسن! ایسے معاملات کچھ سوچ کر کئے جاتے ہیں۔

حسن نے دھڑکتے ہوئے گلے سے ہوں کہا اور گاڑی صاف کرنے لگا۔

میری بیوی نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی۔ میں اذہر گیا تو بولی۔

آپ نے اچھا نہیں کیا۔ چار دی رخصت بھی جبران ہونے والی ہے یہ مثلاً امیر جو غریب ہر

ایک کوشش کرتا ہے۔

اچانک میری نظر اپنی بیٹی پر پڑی جو بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں

خیال آیا کہ حسن کی بہن دو گنی ٹرکی ہوگی جہیں تو وہ اس قدر پریشان ہے

ابھی دنوں میرے دفتر میں ایک لڑکا بطور کلرک کام کرنے کے لئے آیا۔ علم، اطاعت

شمار، نیک نیت، ایک ہفتہ بعد ہی میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچا اگر یہ کنواری ہو

تو حسن کی بہن کے لئے رشتے کی صورت نکل سکتی ہے۔

باتوں ہی باتوں میں میں نے اس کے حالات معلوم کر لئے وہ ماں باپ کا اکھڑا بیٹا تھا

باپ ریلوے سے ریٹائر ہو کر اپنے محلے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان میں عام استعمال کی چیزیں

بیچتا تھا۔ میں نے اذنانہ لگایا کہ اس کے چھوٹے سے کنبے کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ

وہ کسی اچھے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس نے لیکن ہے کہ اس کے والدین حسن کی بہن کو بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ بیوی سے ڈر کر کیا تو اس نے کہا۔

پہلے یہ پتہ چلاؤ کہ کہیں تمہارے اسی کلرک کی انگلی نہ ہو چکی ہو اگر انگلی ہو گئی ہو تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا جائے گا۔

بات منقول تھی۔ یوسف سے دریافت کیا تو اس نے انگلی سے انکار کر دیا۔ اب میری بیوی کا مشورہ یہ تھا کہ حسن کے ہاں جا کر ایک نظر اس کی بہن پر بھی ڈال لینی چاہیے۔ کہیں زیادہ عمر کی نہ ہو۔

حسن سے اس کے ہاں جانے کا ذکر کیا تو وہ اس طرح خوش نظر آنے لگا جیسے اسے کوئی خوشخبری مل گئی ہے۔

وہ سے کے مطابق اتوار کے دن ہم اس کے ہاں چاہے۔ دو گروں پر شکل اس کا گھر تھا لیکن میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ صوفی اعلیٰ درجے کا فریئر ٹری سلیف منڈی سے دکھایا ہوا ہے۔ ہارٹے صاف ستھری تھی۔ اور اس وقت ہماری حیرت اور بڑھ گئی جب ہم نے حسن کی بہن کلمنٹ کو دیکھا اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو میری بیوی کو بھی میسر نہیں تھا۔ پھر اس نے اس خوش سلیف سے ہماری خاطر عادات کی کہیں تو متاثر تھا ہی میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئی۔

ہم گھر سے نکلے گئے تو حسن نے راستہ ٹوک لیا۔

”یگم صاحب جی! میری کلمنٹ ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میں سے دیکھو دیکھو کر جیتا ہوں۔“
 یگم صاحب جی! خوش خوش اپنے گھر میں رہے تو مجھے دنیا کی سب نعمتیں مل جائیں گی یہی میں ایک حسرت ہے۔ اس کا جلدی بیواہ ہو جائے؟ ایک اندوہنی جذبے سے اس کی آواز گلو گلو ہو رہی تھی۔
 ہم نے اسے قہر دی کہ اگر خدا نے چاہا تو تمہاری بہن کے ہاتھ جلد ہی پیلے ہو جائیں گے اور وہ اپنے گھر میں خوش رہے گی۔

میں نے یوسف کے باپ سے پوچھا کہ اگر آپ کے بڑے کا رشتہ ایک ایسی بڑی سے
ٹپے پا جائے جس کا باپ ڈراؤنڈ ہو تو کیا آپ کو اعتراض ہو گا؟

بولے: نہیں جناب!۔ اگر بڑی سگڑے تو مجھے اس پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہو گا اس کا
باپ ایک ڈراؤنڈ ہے۔ میں خود کیا ہوں آخر ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر ہلدی، مرچ لڑھکھالو
بیچنے والا۔ یوسف! آپ کا بیٹا ہے اس کے رشتے کا آپ کو پورا پورا اختیار ہے۔
تو دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایک دن کلثوم دہن بن کر یوسف
کے گھر چلی گئی۔

دوسرے روز حسن میرے گھر آیا تو شکریہ ادا کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں سے الفاظ
نک نہیں نکلتے تھے میں نے دیکھا کہ اس کی بیٹیں آنسوؤں سے بھیل ہو گئی ہیں یہ خوشی اور
اسانندی کے آنسو تھے۔

وہ بدستور اپنی ڈروٹی پر آنے لگا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اب اس میں پہلی سی پھرتی نہیں۔
کام باتا عادی سے کردہ تھا اس نے مجھے کچھ کہنے سننے کی کیا مزدت تھی۔
ایک دن ہفتے کی شام کو آیا اور کہنے لگا۔

صاحب جی!۔ آپ نے مجھ پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں۔ یہ بھول نہیں
سکتا میری کلثوم بڑی خوش ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ اور صاحب جی! کل وہ جو پہاڑ سے
گھر کے سامنے خان صاحب دہستے ہیں تاہری لال مکان والے۔ آپ کے دوست ہیں۔ وہ
صاحب جی! بال بچوں کے ساتھ مری گئے تھے وہ دیکھنے کے لئے جی۔ وہ کیا ہوتی ہے سنو۔
اس نے حقہ کھل بھی نہیں کیا تھا کہ میرے بچے سنوناں، سنوناں کا شور مچانے لگے۔
دے چلوں گا۔ بے چلوں گا حسن بھی خود مچانے لگا۔

نہیں حسن! میں نے انکار اس وجہ سے کیا تھا کہ ایک تو بہنوں کو اس کا روبرو تھا اس کے
علاوہ ایک روز دفتر میں نے ایسا محسوس کیا تھا جیسے وہ ہمارے گاڑی سے نکلے وقت اس کے

قدم ڈالنے لگے تھے۔

”صاب جی! میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ بچوں کی یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کروں۔
آپ مغزوہ میں سے پٹرول کے پیسے کاٹ لیں۔
”نہیں۔ تم شاید بیمار ہو۔ پٹرول کے خرچ کی تو کوئی بات نہیں؟
”میں ٹھیک ہوں صاب جی! میں ٹھیک ہوں۔ سہلا مجھے کیا ہوا ہے۔ کئی اتوار ہے۔ میں
صبح آجاذں گلاہاں صاب جی! اجازت دیں تو اپنی کلثوم اور یوسف سے
”کیوں نہیں! انہیں حضور ساتھ لے آنا۔“

اتوار کا پورا دن بڑی مسرت کے عالم میں گزرا صاب نے خوب خوب مہلت اٹھا یا مگر
میں نے دیکھا کہ حسن گاڑی ہی میں زیادہ وقت بیٹھا رہا۔ باہر نکل کر گھوما پھرا نہیں۔
بیر کو بھی چھٹی تھی۔ جن نہ آیا۔ شگل اور بدھ کے دن بھی گزر گئے۔ میں اس کے گھر جانا چاہتا تھا
کہ بھوی نے منع کر دیا۔

”آدمی بیمار سیار ہو جاتا ہے چند روز اسے گھر میں آرام کر لینے دو۔“
آٹھ دن میں رکٹے ہی میں دفتر آتا جاتا رہا۔ بیمار دن دفتر سے چھٹی لے کر عزیزوں کی شادیوں
میں شرکت کی۔ اب تو اسے کہا جاتا ہے تھکا۔ کیوں نہیں آیا۔ میں نے سوچا۔
دو دن اور گزرے تو اس کے یہاں گیا۔ دھانڈے پر دستک دی تو کلثوم آئی۔
”تھکرا اچھا! کہیں بیمار تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے الفاظ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔
”کیوں کلثوم! کیا ہوا ہے؟“

”جی۔ وہ تو۔ وہ تو“ اور کلثوم کی ہچکی بندھ گئی۔

بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ حسن سر گیا ہے۔

”کب؟“

”جس روز ہم مری سے آئے۔ وہ گھر آکر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہم ہسپتال میں لے گئے
ڈاکٹروں نے کہا انیس سرطان ہے پرانا۔ اور پختے کی دات کو وہ چلے گئے۔ انہوں نے کبھی اپنی
بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ۔“

”ہاں کلثوم بیٹی! وہ صرف تمہارے لئے جیتا تھا۔ میں جانتا ہوں۔“
اور جب میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو حسن کے الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج
اٹھتے تھے۔ میری کلثوم! یہ میرے لئے سب کچھ ہے میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ میری بس
ایک حسرت ہے۔ اس کا جلدی بیاہ ہو جائے۔

ایک منزل کھٹی راہیں

اس رات راشد کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کئی بار کوٹ بدل کر سونے کی کوشش کر چکا تھا مگر نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اسے ہر روز کم و بیش چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ بستر پر بیٹھے ہی سو جاتا تھا۔ اس رات بھی غنودگی کا غبار اس کے اعصاب پر چھا گیا تھا مگر معاملہ یوں تک رہا تھا، اور تھوڑی دیر بعد یہ غنودگی بھی ختم ہو گئی تھی۔

راشد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا، عام ڈاکٹروں کی طرح صحت مند، توانا، قوی، کسی ہسپتال سے وابستہ ہونے کی بجائے اس نے پرائیویٹ پریکٹس ہی کو ترجیح دی تھی اور اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ جب سے ڈاکٹر بنا تھا سناٹا سناٹا زندگی اس کی زندگی ہی سے نکل گیا تھا۔ مہینے میں تمام اخراجات پورے کر کے بھی، اس کی بچت کبھی ڈیڑھ اور کبھی دو سو روپے ہو جاتی تھی جو وہ، بلکہ میں جمع کر لیتا تھا۔

اس کے پاس صرف اس کی ماں رہتی تھی، دونوں بھائی امریکہ میں تھے اور بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں اور لندن میں رہتی تھیں ماں کی بڑی آرزو تھی کہ اس کے گھر میں بہو آئے، مگر وہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا، شاید وہ کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا یا کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جسے بخوشی اپنی رفیقہ حیات بنا کر گھر میں لے آئے۔ بلکہ اس کا نقطہ یہ خیال تھا کہ وہ خوں گوار مستقبل کے لئے دو بیوہ جمع کر رہا ہے اور یہ دوسرا بھی کافی مختار

میں فراہم نہیں ہوا۔

دود سے گھڑیل کی آواز آنے لگی۔ شن شن کی آواز دو مرتبہ گونجی۔ دو بج گئے ہیں اور میں جاگ رہا ہوں۔ یہ احساس اسے عجیب سا لگا۔ وہ مریضوں کو بارہ سکون آور دوا سے چکا تھا اور اس رات وہ خود سکون سے محروم تھا۔

وہ خود بھی دوا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کی جھٹی جس اسے بتا رہی تھی کہ اس کا جلگتے رہنا ہی ضروری ہے۔

”کیس امی کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ آہستہ سے کھولا، جھن کی جی جلائی، اپنی امی کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی، وہاں کھل سکتا تھا، جو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

واپس کمرے میں آکر اس نے ٹیبل لمپ روغن کیا اور کتابوں کے ریک سے ایک کتاب اٹھالی۔ طالب علمی کے زمانے میں ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا اس لئے اس کے یہاں بیڈ ٹیکل کتابوں کے علاوہ کچھ شعروادب کے جھوٹے بھی خریدے سے رکھے رہتے تھے جنہیں وہ کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر پڑھ لیتا تھا اس وقت اس نے جو کتاب اٹھائی تھی وہ بانگ درا تھی اس نے کتاب کھولی اور نظم کے عنوان پر اس کی نظر پڑی بھی نہیں تھی کہ یک لخت اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر آیا ہے اور اس نے کلاں پہل پر اپنی انگلی رکھ دی ہے۔

رات کے وقت کسی مریض کے یہاں جاتے ہوئے اسے خاصی تکلیف ہوتی تھی مگر وہ اسے ڈاکٹر کی ڈیوٹی سمجھ کر بہہ لیتا تھا کبھی اس نے اس معاملے میں شکوہ نہیں کیا تھا اس کے کمرے کے دلالان کی طرف کھینے والی کھڑکی کا شیشہ چمک اٹھا تھا۔ دلالان کی جی جلائی گئی تھی۔

”امی کے سوا اور کون جلا سکتا ہے؟ اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی امی کی آواز آئی۔

ڈاکٹر کو گشت پرست کا نہیں سوہے کا آدمی سمجھتے ہیں۔

”کوئی آری ہے انی؟“

بڑی خاتون نے بیٹے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا فقرہ مکمل کیا جسے آرام کی

حزورت نہیں ہوتی:

”کوئی بات نہیں انی ابھی چند نہیں آ رہی تھی۔“

”کیوں راشد بیٹا؟“

”پتہ نہیں امی! کیوں —؟“ اور وہ باہر جانے لگا۔ بیرونی دروازہ کھولا تو ہوا کا ایک

تیز و تند جھونکا اس کے چہرے سے غصے کے کس چلا گیا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں وہ آنے

والے کا چہرہ نہ دیکھ سکا صرف آواز سن سکا۔

”جناب ڈاکٹر صاحب! ہیرانی کیجئے۔“

”کوئی SERIOUS CASE ہے؟“

وہ رات کو آنے والے شخص سے یہ بات حذور پر چھتا تھا۔

”جی ہاں — ہیرانی کیجئے۔“

والان میں جو طب جیل رہا تھا اس کی روشنی میں اس وقت راشد اجنبی کے چہرے کو بخوبی

دیکھ سکتا تھا، لمبی ناک، کشادہ پیشانی، سر پر گنگھڑا لے بال جن میں کوئی چیز چمک رہی تھی

”کہاں سے آئے ہیں؟ راشد نے سوال کیا۔“

”پرانی انداز کلی سے۔“ جناب دماغ پر آ یا تھا، آپ نے سکون آور گولیاں دی تھیں —

مریضہ کے لئے۔ اب اس کی حالت بڑی خراب ہے جناب! آپ کو یاد آگیا ہوگا؟

”ٹھیک ہے۔“ وہی میں بے شمار مریض آتے ہیں۔“

”جناب! کیسی مل نہیں سکی۔“

”چلتے ہیں۔ راشد اندھ گیا، اس کی امی دروازے پر کھڑی تھی۔“

”انی! قریب ہی جانا ہے، پرانی اندکلی میں، آپ سو جائیں، غفور کو آواز دے کر جگائیں
 دودانہ کھول دے گا: انی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماشد نے یزیدی دراز میں سے گاڑی کی
 چابی نکالی اور واپس ہلنے لگا۔

غفور کو جگانے کی غوریت نہیں پڑی، وہ شور مچ کر بیدار ہو چکا تھا اور گیراج کے پاس
 کھڑا تھا۔ دوست، بد گاڑی ساندہ روٹ پر چلی جا رہی تھی۔

ہوا میں تیزی اور تندہی تھی، اوپر فضا میں بادل چھائے ہوئے تھے بارش کا آغاز نہیں
 ہوا تھا، راہیں خاموش تھیں کبھی کبھی کرنی رکشایا گاڑی قریب دکھائی دیتی تھی اور پھر نظروں
 سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

انجی راشد کے پاس بیٹھا تھا، آگے کی طرف جھکا ہوا بار بار باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک مقام
 پہ پہنچ کر اس نے راشد کو دیکھنے کے لئے کہا۔ گاڑی پرانی اندکلی کے سطحی حصے میں ایک دو
 منزلہ مکان کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب! اس نے جلدی سے دوسری طرف جا کر گاڑی کا دودانہ کھول دیا۔
 وہ جب راشد کا کبض اٹھانے اس کے آگے آگے بیڑیاں طے کر رہا تھا تو اس نے
 درالبنہ آواز میں کہا: ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔“

کمرہ کافی وسیع تھا۔ ایک طرف بنگ کے اوپر ایک دھکی آنکھیں بند کئے نظر آ رہی تھی۔
 ”یہ ہے مریض، ڈاکٹر صاحب!“

یہ الفاظ اس آدمی نے نہیں ایک خاتون نے کہے تھے جو بڑی کھکھار مریض کے بنگ
 کے قریب لے گئی تھی۔

راشد نے کمری پر بیٹھ کر مریض کی طرف غور سے دیکھا۔ ڈکی کیا تھی لگ مر مرے
 فراشی ہوئی ایک عذرا تھی۔ سیاہ زلفیں زخموں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ
 سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

”کیا ہے اسے؟“ راشد نے سوال کیا۔

خاتون نے جواب دیا ”معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب! بدترین گھٹنے ہوئے اسی طرح پرشی ہے، برقی نہیں، آنکھیں بھی نہیں کھولتی“

راشد نے بعض دیکھی، بہت کمزوری سے چل رہی تھی، ہاتھ بڑا گرم تھا، شدید بخار میں مبتلا تھی۔

”کیا نام ہے اس کا؟“

”فاخرہ — میری چھوٹی بہن۔“

راشد نے دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے قین چار بار بلایا۔ فاخرہ کبکڑ سے پکڑا بھی، مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے وحشتانہ انداز میں بیٹھ گئی۔

”فاخرہ! یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔“

اس نے ایک بار گھور کر راشد کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھٹکائیں، اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

راشد اس سے اس کی تکلیف کے بارے میں دریافت کرتا، مگر وہ خاموشی سے کبھی اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال لیتی تھی اور کبھی اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتی تھی، لگتا تھا وہ قہر گویائی سے محوم ہو گئی ہے یا اس کے اندر ایک ایسی کشمکش طاری ہے کہ کچھ کہنا اس کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔

راشد نے اسے چیک اپ کیا، وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی بظاہر تندہ دست معلوم ہوتی ہے پھر اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے!

”کیا اسے ذہنی صدمہ تو نہیں پہنچا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا، اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آدمی بھی خاموش تھا اور وہ خاتون بھی۔ مگر خاتون کی آنکھوں سے کچھ ایسا تاثر ترشح تھا گویا دل کی بات کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

”خیر — یہ دوا دے دیتا ہوں — صبح ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے کلینک میں لایئے — جلدی نہیں — بارہ بجے کے قریب دس کم ہوتا ہے ابھی طرح دیکھوں گا۔“ راشد نے یہ الفاظ سروسے کہے تھے جو خاتون کے پاس کھڑا تھا۔

”بہتر جناب؟“

راشد نے نسخہ لکھ دیا۔

”یہ ہسپتال کے پاس دو تین دکانیں کھلی ہوں گی۔“

”مجھے معلوم ہے جناب۔“

مریض اسی طرح خاموش رہے جس وحشت منشی تھی اس کی لابی لابی پکوں نے آنکھوں کے نیچے سائے سے ڈال رکھے تھے۔

راشد جب گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص پوچھ رہا تھا،

”فیس، جناب؟“

راشد نے دائیں لم تھ کے اشارے سے جو مناسب سمجھو سروسے کا اظہار کیا۔ اس آدمی نے جیب سے نوٹوں کا ایک بٹل نکالا اور راشد کے سامنے پیش کر دیا۔ راشد نے بغیر کسی اندازے کے چار پانچ نوٹ نکالے اور جیب میں ڈال لئے، بکس گاڑی کے اندر دکھایا چکا تھا راشد نے خدا حافظ کہا اور گاڑی شارت کر دی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ آرام کرسی میں دھنس گیا سامنے کھرنکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے بار بار آپس میں ٹکرا کر کمرے کے سکوت کو جبروج کر رہے تھے۔ اس کی اتنی آگئی۔ وہ اس سے یہ نہیں پوچھتی تھی کہ مریض باہر بیٹھا کیا حال ہے۔ اس کی بھلے وہ چلنے کے لئے پوچھتی تھی۔

”پیو گئے؟“

”نہیں، امی! ذرا آرام کروں گا، باہر سروسے ہوا چل رہی ہے۔“

”خود کو ڈھانپ لانا — گرم چائے ٹھیک رہے گی۔“

انہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ راشد نے اپنے پاؤں آرام کرسی کے آگے تپائی کے اوپر پھیلا دیئے۔ معاً اس کے سامنے مریض کی شکل آگئی۔ وہ اس کا کوئی مرض تشخیص نہیں کر سکا تھا کیا بیماری ہے اسے؟ اس نے خود سے سوال کیا، کوئی جہانی بیماری تو نہیں — پھر کیا نفسیاتی بیماری ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب آگیا ہے۔ مفید رنگت جس میں کہیں کہیں لہری کی بہت سی ہلکی اور مدہم سرخی دلا بخا لابی پگھیں دھوٹ پھینچے ہوئے۔

وہ اپنے کلینک میں ہر روز کئی عورتوں اور بچوں کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی بار گھروں میں جا کر بھی اس نے متعدد ایسے چہرے دیکھے تھے جو حسین اور دلاؤیز کہے جاسکتے ہیں مگر توجہ تک کوئی چہرہ بھی کلینک سے یا کسی گھر سے اس کے ساتھ کمرے تک نہیں پہنچا تھا۔ چند منٹ آرام کر لی۔ میں بیٹھ کر جب وہ گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا تھا اور اس کی انہی گھر بسو سال پر اس سے کچھ گفتگو کرتی تھی تو وہ دن بھر کی کا دردانی تجھول جاتا تھا اور جب کھانا کھانے کے بعد کمرے سے چل تھکی کے لئے نکلتا تھا تو خود کو ایک نئے ماحول میں پاتا تھا۔ جہاں نہ تو مریضوں کی سرچھائی ہوتی کہ بناک سورتیں ہوتی تھیں اور نہ مختلف دواؤں کے قصورت اس کے ذہن کو پریشان کرتے تھے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس رات اس نے جو چہرہ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھا وہ اس چہرے کے تمام خود خال واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

”خود اس کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے اور نہ ابھی خاصی صحت مند ہے۔ اس نے سوچا کسی واقعے کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض بنی ہے — یہ واقعہ کیا ہو سکتا ہے؟ انجوان ڈوگرل کو عام طور پر ایک ہی بیماری ہوتی ہے — عبت میں ناکالی کے بعد کرن نفسیاتی الجھن — شاید اسے بھی — ہو سکتا ہے — عین ممکن ہے۔“

”راشد بیٹا! کیا معاملہ ہے؟“

اس نے چرنگ کر دائیں طرف دیکھا، اس کی انی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔
 ”ای! کیوں تکلیف کی آپ نے؟“

اس کی انی نے زبان سے کوئی لفظ نہ کہا، پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔
 ”SERIOUS CASE ہے؟“

یہ سوال خلاف معمول کیا گیا تھا۔
 ”نہیں انی! کوئی ایسی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“
 ”کوئی عودت ہے؟“

راشد نے سر کے اشارے سے اس کہہ دیا۔
 انی وہیں کھڑی تھی۔

”آپ آرام کریں انی! تھوڑی دیر کے لئے شاید میں بھی سو جاؤں گا۔“
 وہ آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا، کھڑکی کے پٹ زور سے ٹکرائے، اس نے ادھر دیکھا جہاں
 ایک سیاہ بادل میں غائب ہو رہا تھا، اچانک پھر وہی چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ پیالی
 اس کے ہونٹوں کے قریب آئے آئے رک گئی۔
 ”وہ آدمی اس کی حالت جاننے کے لئے کلینک میں آئے گا۔ اس کا مریض سے رشتہ کیا
 ہے۔ وہ خاتون تو اس کی بڑی بہن ہے۔ اس نے خود ہی بتا دیا تھا۔“
 ہوا زیادہ تیز و تند ہو گئی تھی کیونکہ کھڑکی کے پٹ زیادہ زور سے ٹکرا رہے تھے۔ اس نے
 دیکھا کہ کھڑکی کی طرف ایک ہاتھ بڑھ رہا ہے۔

”انی! ابھی تک یہیں ہیں اور کھڑکی کے پٹ بند کر رہی ہیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔
 چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی جو قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے پیالی تپائی
 پر دیکھ دی۔ پاؤں پیٹے اور کھڑا ہو گیا۔
 ”انی!“

”تم آج کچھ ٹکڑے ہو — ہاں یاد آ رہا، کب کی ماں آئی تھی — یہ کہہ کر اس کی ہاتھ لے
 بیٹے کے چہرے کو تجسس نظروں سے ٹھولا۔ مگر جس جذبے کی اسے تلاش تھی وہ نظر نہ آیا۔
 ”ٹھیک ہے اتنی!“

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی،
 ”وہ امید باندھے بیٹھی ہے۔“

”اتنی؟“ راشد نے دو تین لمحے ٹک کر جواب دینا نہیں کیسی کسی امیدیں باندھی جاتی ہیں کوئی کسی
 کو امید باندھنے سے روک سکتا ہے — نہیں — نہ آپ۔
 ”سوچنا تو چاہیے؟“

”صبح میں گئے اتنی! وقت آنے پر یہ بھی سوچائے گا۔“
 ”وقت کب آنے گا؟“

”نہ کیجیے کب آتا ہے۔“

ماں چلی گئی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر، راشد نے غصوں کیا کہ وہ کچھ دیر سوچ کر گئی ہیں، اس
 کا بھی چاہتا تھا کہ ماں کو روک دے اور کہے ”اتنی! ابھی مجھے کام کرنا ہے، مجھے شادی کی زنگین
 میں کیوں جکڑتی ہو؟“

مگر وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہو گیا اور وہ کرسی میں
 نیم دراز ہو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے پینے چمک رہے تھے، مانی گاڑا! اتنی دیر ہو گئی۔
 وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا، غصہ چلنے کی پیمانی لے کر دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔

”تیسری یاد آ رہا ہوں صاحب جی!“

”مجھے جگا دیا ہوتا بابا!“

راشد نے کلائی کی طرف دیکھا۔ سات بج گئے تھے۔ اس وقت تک تو وہ ناشہ کر کے
 اخبار بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے غصہ سے چائے کی پیالی لے لی۔ چند گھونٹ لئے اور بلاؤ
 "انی کیا کر رہی ہیں؟"

"جی صاحب جی! وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں؟
 "ابھی آتا ہوں۔"

راشد ہاتھ روم میں چلا گیا۔ اور جب ناشہ سے نارغ ہو کر گاڑی گیراج سے باہر
 نکال رہا تھا تو اٹھ بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے، وہ گرمیوں میں آٹھ بجے کلینک پہنچ
 جاتا تھا۔

اس روز مریضوں کا مجموعہ کچھ زیادہ تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کچنڈر
 کو ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کے پاس ایک مواد اس کے بعد ایک محنت کو بھیجے۔ کوئی
 مریض اس کے سامنے سٹول پر بیٹھی تھی تو وہ بے اختیار اس کی طرف دیکھتا تھا اور پھر جیسے
 اس سے مرض کی کیفیت پوچھنے لگتا تھا۔

ایک بچے میں دس منٹ باقی تھے جب کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔
 میں جناب! کچنڈر کی آواز آئی۔
 "دیکھ کوئی آیا ہے؟"

"جی کوئی نہیں۔"

وہ کلینک سے نکل کر مٹی کے صفے کی طرف جانے لگا جہاں وہ گاڑی کھڑی کیا کرتا تھا۔
 اس نے موٹر پر جا کر کلینک کی طرف دیکھا۔ کچنڈر بیرونی دروازے پر تالا لگا رہا تھا۔

کھانے کی میز پر ایک پوجھل خاموشی طاری رہی۔ اس کی انی ہر روز کوئی ڈکونٹی نئی ڈش
 بناتی تھی اور امراء کے بیٹے کو کھلاتی تھی۔ مگر اس روز اس نے کوئی نئی ڈش نہ دی تھی۔
 "انی! آپ کی طبیعت خفیک ہے نا؟ اس نے پوچھا۔

”اللہ کا فضل ہے — ٹھیک ہے — آج میرا تجربہ ناکام ہو گیا ہے ڈش خراب ہو گئی۔“

”تو آپ کی بجائے ڈش کی صحت خراب ہوئی؟ وہ آپس پڑا، ہاں سکرانے لگی۔“

”راشد بیٹا! تجھ میں مرض اور صحت کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا۔“

راشد سمجھ گیا کہ اتنی کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اگلے پرن سے کہا:

”اتنی! آپ نے مجھے ڈاکٹر جو بنا دیا ہے — اس نے میرا تعلق انجی ویزروں سے ہے۔“

لوں بیٹا! ڈاکٹر کو دنیا میں کسی اور چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ دوست کہتے ہو:

اتنی کے لیے میں ایک چھپا چھپا طرز تھا جسے راشد نے محسوس کر لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب چار بجے تک وہ ناراض تھا۔ پونے

دو بج چکے تھے۔ دوبارہ کلینک میں جانے سے پہلے آرام کرنا ضروری تھا۔ وہ ہینک پر لیٹ

گیا، سو کر اٹھا۔ نہادھو کر چائے پی تو کلینک میں جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

”اتنی! جا رہے ہوں۔“ اس نے محول کے مطابق ماں کو اطلاع دی اور اس کی ڈھیر ساری

دعاؤں کے ساتھ میں باہر نکلا۔ کلینک جاتے وقت اسے مریضوں ہی کا خیال ہوتا تھا۔ فرور

کی حالت زیادہ خراب تو ہو گئی ہوگی۔ ناطہ نے شوم ہو کر باتا دھنگی سے دوا دی ہے یا نہیں۔

ایسی ہی باتیں اس کے ذہن میں ابھرتی اور دوڑتی رہتی تھیں۔ مگر اس دن صرف اس مریض

کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گذشتہ رات اس نے پرانی انارکلی کے ایک مکان میں

دیکھا تھا۔

اسے اپنے ہر مریض سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ یہ اس کا شروع ہی سے رویہ تھا۔ اسے

اس نئی مریض سے بھی ہمدردی تھی لیکن اس ہمدردی میں ایک ایسا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا جو

ابھی تک اس کے لئے غیر مبہم تھا۔ جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس شام بھی اس نے اس مریض کا انتظار کیا — وہ نہ آئی۔

آخر تک چلے تھے۔ کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔ گھر جانا چاہیے، امی منتظر ہیں گی۔ اور یہی فیصلہ کر کے وہ گاڑی میں بیٹھا لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت پہلی کہ اس کی گاڑی پرانی گاڑی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

تین بار دروازے کے باوجود کھڑکی میں سے نہ کوئی چہرہ بھانکھا اور نہ کمن نیچے آیا۔ چوتھی بار دروازہ دیا تو وہی شخص نیچے آیا جو اسے اس گھر میں لے کر آیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب: اس کے پیچھے سے بڑی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا آپ نے مریض کی حالت نہیں بتائی، زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو؟

بڑی تکلیف کی ڈاکٹر صاحب: آپ نے؟

بیڑیاں ملے کرتے ہوئے راشد نے پوچھا:

”وہ پلانی تھی؟“

”میری بیوی نے پلانی ہوگی، میں بازار سے لے آیا تھا۔“

مریض کی بڑی بہن نے خیر مقدم کیا۔

”میں نہیں گیا تو ڈاکٹر صاحب خود ناخروہ کو دیکھنے کے لئے آگئے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی، شریف دیکھیے۔

خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: راشد بیٹھ گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”وہ نظر نہیں آ رہی۔“

”جی وہ اوپر ہے اپنے کمرے میں۔ وہاں اس نے ایک ڈائریجری بنا رکھی ہے۔ زیادہ

وقت وہیں گزارتی ہے۔ بھلائی ہو۔“

خاتون دائیں طرف پردے کے پیچھے چلی گئی۔

”ابھی نہیں؟ راشد نے اسے واپس بلا تے ہوئے کہا۔“

دیکھیے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی بہن کی کیس ہسٹری بتائیے۔

میرا مطلب ہے یہ بتائیے کہ کب سے اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے۔ اس کا مرض شاید نفسیاتی ہے۔ بظاہر تنہا معلوم ہوتی ہے؟

راشد نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیل گئے ہیں جو اس کے دل پہلے کب کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مرد خود راشد کے پاس کھڑا تھا۔ وہ دوازے کی طرف جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب: آپ اس کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکتے؟
"میں جہانی مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں۔"

یہی اس کا مرض جہانی نہیں۔! نہیں ہو گا۔ آپ بہتر جانتے ہیں! وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے کرب ناک اثرات شاید غم سے ہو گئے تھے یا راشد نے ایسا محسوس کیا تھا۔

"کل رات جب آپ کو زہت دی اس کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سانس لینے لگی تھی چھت کو تکلی باندھ کر دیکھنے لگی تھی۔ میں ڈر گئی آپ نے جو مدد دی اس سے یہ غامض غمزدہ ہوا کہ اس کی بے حسینی کم ہو گئی۔"
"کیا ممکن ہے کہ بے حسینی عود کر آئے؟ راشد نے پوچھا۔
وہ خاموش رہی۔

ڈاکٹر صاحب: آپ نے درست کہا ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا ہے جس سے وہ نفسیاتی مریض بن گئی ہے؟
"کیا ہے وہ حادثہ؟"

وہ سر جھکا کر کڑی کے بازو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ راشد اس کی طرف تکلی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنی بہن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے متعذب ہے اس نے دو چار لمحے انتظار کیا، پھر بولا:

"میں ڈاکٹر ہوں، آپ کی بہن کا علاج کرنا چاہتا ہوں؟"

”میں سمجھتی ہوں۔ مگر ناخزہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کی دودھ دہنسی کو سٹائی جانے
 دیا اور ہرے، بچے، خنزیر، بچے نہ آجائے۔ بڑا ملنے لگی۔ اور کچھ نہیں کہے گی۔ تو
 نازوق قطار دونا ہی شروع کر دے گی۔ وہاں دو مرتبہ ہو چکا ہے ہمارے ایک عزیز حکیم صاحب ہیں
 وہ آیا کرتے تھے، دو سال ہوئے کراچی چلے گئے ہیں۔“

”وہ کچھ نہیں کر سکے؟“ راشد نے پوچھا

”جی نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ بہر حال آپ ٹھیسے، اہم دوا نہیں ہیں، سہاٹی کوئی نہیں۔
 میرا نام نامہ ہے اور اس کا نام تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ میری عمر چودہ برس اور ناخزہ کی
 سات برس کی تھی کہ جب ہمارے آبا جی دنیا سے چلے گئے تھے۔ آبا جی کے انتقال کے چھ
 سال بعد اتنی بھی رخصت ہو گئیں۔ میری کلنی انی اپنی زندگی میں کر چکی تھیں۔ ان کے چلے
 جانے کے ایک برس بعد میری شادی مسعود سے ہو گئی جو ہمارا دودھ کا رشتہ دار ہے اس کے سارے رشتہ دار
 عزیز کراچی میں ہیں اور میں ناخزہ کو کسی کے حوالے کر کے جا نہیں سکتی تھی اور ناخزہ اپنا گھر چھوڑنے
 پر رضامند نہیں تھی، اس لئے مسعود میں رہنے لگا۔“

ناخزہ کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اسے
 سننے کے لئے راشد کو اس کی طرف جھکنا پڑا تھا۔

”مجھے اپنی بہن سے عید محبت ہے۔ شروع شروع میں مسعود سے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ عموماً
 اس سے شاکہ کرتا تھا کیونکہ ناخزہ بہت اچھے اخلاق کی عڑکی ہے مگر کبھی کبھی ضدی بھی ہو
 جاتی ہے۔ اس وقت کسی کی نہیں سنتی۔ جب وہ حادثہ ہوا تو مسعود کا رویہ بدل گیا اور وہ اس
 سے اچھا سلوک کرنے لگا۔“

”ناخزہ کا گھر بسا ہمارا فرض تھا۔ ریاض مسعود کا دوست تھا اور اس کے دفتر میں ہی
 کام کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ سے رشتے کی بات چیت ہونے لگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
 ناخزہ ریاض کی دواہن بن گئی اور اپنے نے گھر میں چلی گئی۔“

”میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے دلدلی ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی میں دوستی
مطابقت پیدا ہو گئی تھی، اور یہ خوشگوار زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مگر ابھی دو سال بھی
نہیں گزرے تھے کہ ناخوہ اور اس کے شوہر میں کشمکش مں رہنے لگی۔

”میں سمجھتی تھی یہ کشمکش سمرلی قسم کی ہے وہ ہو جائے گی خاص طور پر اس حالت میں کہ
ناخوہ ماں بننے والی تھی، لیکن میرا خیال درست نہ نکلا۔ ایک روز میں اس کے یہاں گئی تو وہ
اپنے کمرے میں لمبی طرح انہی پر ہی تھی مجھے دیکھتے ہی برس چڑی باجی، آپ انہیں سمجھاتی کیوں
جس، ہر وقت دوستوں میں گھرے رہتے ہیں، گھر کی ذرا پردائیں کرتے۔ میرا کوئی خیال
نہیں کرتے۔

میں نے کہا: ناخوہ۔ بات کیا ہے؟

ریاض وہیں تائین پر بیٹھا تھا۔ بولا: آپ، میں بتاتا ہوں بات کیا ہے، یہ چاہتی ہے کہ میں
ہر وقت گھر میں بیٹھا رہوں، ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہ جاؤں۔ میں نے ٹادی کی ہے
اپنے پاؤں میں ذخیرہ نہیں ڈالوان؟

ناخوہ کہتی تھی کہ وہ آدمی آدمی رات تک دوستوں کے پاس رہتا ہے اور ریاض گھر سے
باہر رہنے میں خود کو حق بہانہ سمجھتا تھا۔

میں نے بہن کو سمجھایا کہ بچہ ہو جانے کا تو تہہ سے شوہر کی گھر سے دلچسپی خود بخود بڑھنے لگے
گی، جس سے کام لو۔ آنے والے وقت کا انتظار کرو۔

یہ اسی بڑی کشمکش کی ابتدا تھی جس نے دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا اور وہ ایک
”دوسرے سے بیزار رہنے لگے۔

”بچہ ہوا اور یوں نگاہیں حالات سدھ جائیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں
کا طوفان ختم ہو جائے گا۔“ بلکہ میری توقع پوری ہو رہی تھی۔ سلیم نے اپنے ماں باپ کو
ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ مگر طوفان جسے میں سمجھتی تھی کہ ختم ہو گیا ہے۔

ختم نہیں ہوا تھا صرف ختم کیا تھا:

نامرہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی وہ سامنے پردے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے اور پر جانے کے لئے بیڑھیاں تھیں۔ پردے کو شاید جنبش ہوئی تھی یا نامرہ نے یوں محسوس کیا وہ کہنے لگی۔

”بیشم ایک سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں کو اپنے اپنے سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر ناخزہ یہ بات برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر تین چار گھنٹے اپنے دوستوں میں گزارے اور کبھی کبھی رات کو بھی دیر سے آئے۔ دوسری طرف ریاض بھی اپنی برسوں کی عادت چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

”ایک رات وہ بڑی دیر سے آیا، ناخزہ نے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا، اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔“

دردانہ کھلا تو ان میں سخت لڑائی ہوئی۔ ناخزہ نے کہا، دیکھ اگر وہ اپنی عادت نہیں چھوڑے تو وہ اس کے گھر میں نہیں رہے گی۔ اور ریاض کی انا بھی کسی طرح شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

ریاض کے گھر والوں نے دونوں کو بھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ناخزہ صبح ہوتے ہی اپنی طرف سے شوہر کا گھر بیضہ کے لئے چھوڑ کر ہمارے پہلے آ گئی۔ نامرہ اٹھی، بیڑھیوں والے پردے کی طرف گئی اور دوسرے لمبے واپس آ گئی۔

”صاف کیجئے۔ میں اپنی بہن کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ ناخزہ مجھے کوئے کرادھر آگئی۔ حالات اس قدر ناخوشگوار اور تلخ ہو گئے تھے کہ وہ ریاض کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ میں اس سے کہتی تھی دیکھو ناخزہ! یہ تباہی بہن کا گھر ہے۔ تہارا گھر وہی ہے جہاں تہارا شوہر رہتا ہے۔ آخر تمہیں دریں جانا ہے۔ کل کی بجائے آج ہی کیوں نہ چلی جاؤ! اگر وہ بیری بات سن کر جھنجھلا جاتی تھی اور کہنے لگتی تھی ہاجی! اگر تمہیں میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ کوئی ذکر نہ چمت بچے پناہ دے دی دے گی۔ میں

اس سے لپٹ جاتی۔ ایسا تو کہو ناخوہ! یہ چھت قبائے ہی گھر کی چھت ہے جس کے سائے میں تم بلی بڑھی ہو۔ لیکن میری بہن! شادی کے بعد طکی کا گھر چکے کاڑیں سنسرلی کا گھر ہو گئے۔
 ناموہ نے ایک لمبی تھو بھری میری بہن نے اپنی ضد چھوڑی اور ریاض نے اپنی انا کی
 چار دیواری سے باہر نکلتا پسند کیا۔ دن گزرتے گئے۔ ابھی سلیم بیمار ہو گیا۔ میں نے بہن سے
 برمنت کہا، جس طرح سلیم بیمار رہا ایسا ہے ریاض کا بھی ہے؟
 "تو میں کیا کروں؟ وہ تلخ لمبے میں بولی۔
 "اے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا بچہ بیمار ہے۔"

"تو کیا میں پیار بچے کو گود میں لے کر رہے غیرت بن کر اس کے صدمے پر دستک دوں
 کہ اس کا علاج کرواؤں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لئے دوا دارو کا انتظام کرنا مشکل ہے۔
 باہی! کہیے آپ کی کیا رہی مشا ہے؟
 "نہیں، میری یہ مشا نہیں ہے۔"

"آپ کی جو مشا ہو، مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی،
 میں اپنی ساری چیزیں بیچ دوں گی، اپنے بچے کا علاج کرواؤں گی۔
 میں نے سمجھ لیا کہ اس موضوع پر گفتگو سے فکری بڑھ جائے گی، خاموش ہو گئی۔
 ریاض کو بچے کی علالت کی خبر مل گئی۔ وہ آیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر دونوں کے
 دل صاف ہو جائیں گے۔ وہ بچے کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر اس کا باقاعدہ علاج
 ہو سکے۔ مگر ناخوہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ ریاض ذرا نرم پڑ جانا، مگر ناخوہ ذرا تحمل سے کام لیتی۔
 لیکن وہ تحمل کے اظہار سے باز رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے
 نسخہ لکھا۔ ریاض دواؤں خرید کر لے آیا۔ وہ اس وقت بھی کہتا تھا کہ یہاں بچے کو باقاعدگی
 کے ساتھ دوا دینا ممکن نہیں ہو گا۔ مگر ناخوہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ چنانچہ وہ سخت ناراض ہو کر

چلا گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ آئندہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔

”میرے لئے یہ مصدقہ حال بڑی اذیت ناک تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ بے بس تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بچے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ناخوہ اس کے لئے وہ سب کچھ کرتی تھی جو ماں اپنے بچے کے لئے کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی صحت گرتی ہی گئی۔“

سلیمان بھڑناٹھ دانتا۔ لگتا تھا اس کا بخار اتر گیا ہے اور وہ شام گئی جس نے میری بہن سے ساری غریباں چھین لیں۔ یہ شام عام شاموں سے مختلف تھی تیز و تند ہوا کے تھوکنے چل رہے تھے۔ اندھیرا تیزی سے فضاؤں میں گھٹنے لگا تھا ناخوہ اُدھر اپنے کمرے میں تھی بلکہ ایک اس کی بھرائی ہوئی آواز تباہی کہتے ہوئے سنائی دی۔

میں اُدھر گئی۔ ناخوہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر سے ہلو پہرہ لٹکا تھا اور سلیم پتنگ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

بچے کو مارتے دیکھ کر، گھبرا کر وہ بچے آنا چاہتی تھی کہ وہ دکان سے نکلا کر گر پڑی تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اور میرے شوہر نے ناخوہ کو سنبھالا۔ اس کے سر کے زخم پر پٹی باندھی لیکن اس کے دل پر جو زخم لگ چکا تھا اس پر پٹی باندھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ ریاض آیا اور بچے کو دھلتے ہی چلا گیا۔ مگر بچے کی زندگی ان دونوں کو قریب لاکھ موت۔ میری بہن اس حادثے کے بعد کھوئی کھوئی رہتی تھی جس طرف دیکھتی تھی دیکھتی ہی چلی جاتی تھی۔

اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو حالات زیادہ نہیں بگڑ سکتے تھے۔ ریاض کیسٹیا چلا گیا اور اس کے دل میں جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ناخوہ کو طلاق کا کاغذ بھیج دیا۔ وہی جیسی اُسیدہ لگ ختم ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب! میری بہن کچھ انباز مل ہو گئی ہے۔ اس کے شب و روز کا صرف ایک ہی مصروف ہے اور وہ ہے کتابوں کا مطالعہ۔ نئی نئی کتابیں خرید کر لاتی رہتی ہے اور

اور پریشان کر مٹانے کرتی رہتی ہے۔

زندگی کے معمولات ٹھیک طور پر نہ رہی۔ — برصورت بڑے کمزور ہے۔ —
شام کے وقت اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے خاص طور پر ایسی شام کو جو طوفانی ہو
— کل ایسی ہی شام تھی۔ وہ اور بھتی — میں اسے ماحول میں اسے تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔
کل ایک جزوی کام کرتے ہوئے جلدی اور پر نہ جا سکی۔ اور بگنی تو وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئے
ہوئے سانس لے رہی تھی — آنکھیں بند تھیں۔

○

نامرہ خاموش ہو گئی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ راشد نے آنکھوں
سے عینک اتاری، جیب سے ردال نکال کر اس کے پیشے — فک کے نگار — ایک نامرہ
اٹھ بیٹھی۔ سیریسوں والے پردے کی طرف گئی۔ راشد نے ردال تہہ کر کے جیب میں ڈال دیا۔
عینک آنکھوں پر لگا ہی رہا تھا کہ نامرہ کی آواز آنے لگی:

”ناخرہ، ناخرہ! نہ ہیں، نہ ہیں! دیکھو ناخرہ!“

راشد اُدھر جانے لگا۔ اس نے پردہ ہٹایا۔ ناخرہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اپنی سسکیاں
دبانے کی تاکم کو شش کر رہی تھی۔

”ناخرہ! راشد نے اپنے لمبے میں ٹکس حد تک طاقت پیدا کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔
ناخرہ تیزی سے سر جھپٹا کر گئے گئی اور اوپر سے زور کے ساتھ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔
”دیکھا آپ نے؟“ نامرہ نے دندھے ہوئے گلے سے کہا۔

”پریشان ہوئے کی بات نہیں، انبار مل کیس ہے؟“

”نہ جانے کب سے یہاں کھڑی تھی۔ اپنے متعلق کچھ بھی کہنا سنا نہیں چاہتی۔“

”بعض انبار مل لوگوں کا یہی رویہ ہوتا ہے شاید اس نے دروازہ بند کر لیا ہے؟“

”جی ہاں! مشکل ہی سے کھولے گی۔“

راشد کا ذہن متعذب ہو گیا تھا اور جا کر اسے دروازہ کھولنے کے لئے کہے یا اس حرکت

سے باز رہے۔ نامرہ نے اس کے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔
 ”ڈاکٹر صاحب! آئیے بیٹھ جائیے۔ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہت قحطی وقت ہے
 آپ کا۔ اور نامرہ وہیں آنے لگی۔ راشد بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دونوں کرسیوں پر
 بیٹھ گئے۔

”میرا ایک دوست ہے، دماغی امراض کا معالج، میرا خیال ہے۔“
 راشد فقرہ مکمل ذکر سکا۔ نامرہ نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔
 ”انسان کو ہر طرح کو خشش کرنی چاہیئے۔“

”گھبرہ جانے لگی نہیں ڈاکٹر صاحب!“ نامرہ کا حتمی جواب تھا
 ”میں ڈاکٹر سے وقت معذور کروں گا۔ اس وقت آؤں گا۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ بڑی تکلیف کر رہے ہیں۔ آپ۔۔۔ نامرہ کی جھجھکی نہ
 آیا کہ اپنے جذبات کا کس طرح اظہار کرے!
 ”نامرہ! اگر میرے تکلیف کرنے سے کسی کی حالت سدھر جائے تو میں اسے تکلیف نہیں
 کہوں گا۔“

راشد نیچے اتر گیا۔

وہ کبھی دیر سے گھر آتا تھا تو اس سے تاخیر کی وجہ نہیں پوچھتی تھی صرف یہ پوچھتی تھی
 ”راشد بیٹا! مریض کی حالت اچھی ہے یا وہ کبھی سٹی کر اس کا بیٹا عزیز کسی مریض کے گھر
 سے آ رہا ہے۔ اس نے یہی سوال کیا۔

”نفیاتی بیماری ہے۔“

”کیوں؟“

”اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہوا ہے۔۔۔ بگڑا حادثہ ہوئے ہیں۔۔۔ بانیس
 تیس برس کی لڑکی ہے۔“

”اللہ رحم کرے۔۔۔“ اور وہ کھانا لانے کے لئے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

سوئے سے پہلے اس نے ماں کو نافذہ کی ساری رودادوں سنا دی اور وہ اس کی صحت کے لئے دعا کر کے سوئے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

راشد کے علاج میں دو تین بار یہ سوال اُبھرا ”اگر وہ جانے کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو۔۔۔“ اس سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ مگر دوسرے روز کلینک میں جا کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کو بلا لیا اور اس سے تین بجے کا وقت مقرر کر لیا۔

کلینک سے نکلے ہوئے پونہ ایک بج چکا تھا۔ سارا دو بجے وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ماں نے پوچھا،

”غیر قریبے بیٹا؟“

”ای! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ اس ٹرکی کو ڈاکٹر لطیف کے پاس لے جانا ہے؟“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگی ”جیسا تھا۔“

مسعود ماں کی پہلی آواز پر ہی نیچے آ گیا۔

راشد گاڑی سے نکلے گا۔

ڈاکٹر صاحب! وہ نہیں جانے گی، بڑی ہنسی ہو چکی ہے۔ بہن نے بات کی تھی تو وہ زور سے سوئے لگی تھی۔

”چلیے تو یہی، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

راشد مسعود کے ساتھ اوپر آ گیا، نامرہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مایوس دکھائی دیتا تھا۔ اس مایوسی کے علاوہ وہ راشد کا غیر مقدم بھی نہ کر سکی۔ وہیں کھڑی رہی۔

”کہاں ہے؟“ راشد نے پوچھا۔

نامرہ نے سر کے اشارے سے کہہ دیا: ”اوپر ہے؟“

”نیچے نہیں آئے گی؟“

”اس نے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے
میں جگڑ گئی۔ اوروں نے گلی میرے ساتھ یہ مذاق کرنا چھوڑ دیں؟

”کوئی بات نہیں، میں اور پریشان ہوں۔“

راشد پردے کی طرف جانے لگا۔ مسعود نے قہری سے جا کر پردہ ہٹا دیا۔ چند میٹر چھوٹے کے
بعد راشد اور نامہروہ ناخروہ کے کمرے میں تھے۔

”کمرہ مختصر تھا، فرنیچر بھی مختصر تھا، اگر صاف ستھرا معلوم ہوتا تھا کہ ناخروہ نے سامان رکھنے
اور کتابوں کو ترتیب کے ساتھ سمجھانے میں بڑے اچھے اور صاف ستھرے ذوق کا ثبوت دیا ہے
میں بھی پرگندگی اور انتشار کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

جب راشد اور نامہروہ کمرے میں پہنچے تو وہ لڑی میں دھنسی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی
تھی۔ راشد کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لڑی سے اٹھ کر بیٹھی۔ راشد اس سے مخاطب
ہو کر کہنے لگا:

”معاف سمجھئے، آپ کے مطالعے میں مداخلت کی ہے معاف کر دیا ہے نا آپ نے؟“
ناخروہ دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد برلی،
”فرمائیے؟“

”فرماتا دانا کیا ہے ناخروہ؟“ قبلہ سے پاس اس امید کے ساتھ آیا ہوں کہ تم میری مدد کرو گی۔
ناخروہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں جھپکائیں۔
”مسئلہ یہ ہے کہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے، ذرا بے وقوف ہے۔“
راشد سکرانے لگا۔

”یہ لڑکی اپنی برائی اور بھلائی سے بے نیاز ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میری مدد کرو۔“
نامہروہ بڑی سنجیدہ مگر راشد کے یہ الفاظ اس کے سکرا اٹھی۔

”خدیجوں کو اسے ذرا ابا ہرے جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔ اس میں اس کی اپنی بھلائی ہے

ناخرہ؟ کیا تم میری مدد نہیں کرو گی۔ مجھے ایسی مدد کی؟

ناخرہ کا سر ٹھٹھا ہوا تھا۔ راشد اور ناصرہ۔۔ دونوں اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سر ذرا اٹھایا اور کب تک ہلچے میں بولے:

”یہ سب فضول ہے۔ بے سود ہے۔ کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔“

راشد اس کے اور قریب ہو گیا۔

”تم دوست کہتی ہو۔۔۔ مگر مستقبل کے متعلق کوئی شخص کوئی بات بھی وٹوق سے نہیں کہہ سکتا۔ انسان کو میرا حال بہتری کی توقع رکھنی چاہیئے۔ میں نے دوست کہا ہے نا؟“

ناخرہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب ٹھٹکی باندھ کر باؤں کے ایک ایک کدو دیکھ رہی تھی۔

”چلو ناخرہ؟“

”پہلے، آتی ہوں؟“

ناصرہ کو یہ الفاظ سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ وہ راشد کے لئے دو دروازے کا پردہ بھی نہ ہٹا سکی۔ یہ کام راشد نے خود کیا۔

راشد کو گاڑی میں بیٹھے چھ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ وہاں بہنیں آگئیں۔ ناخرہ نے لباس بدل لیا تھا۔

”ٹھیک رہا مجھے یہ امید تھی۔ یہ کہہ کر راشد نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ دونوں بہنیں اندر بیٹھ گئیں۔ راستے میں خاموشی رہی یہاں تک کہ گاڑی ڈرونگ کی ایک کڑھکی کے پورچ میں جا کر کی۔

راشد نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا، پھر کال بیل پر انگلی دھکے دی۔ ملازم نے انہیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ڈاکٹر لطیف آیا۔ من بجاس سے اوپر۔ چہرے پر ملائمت۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک۔

تینوں کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر لطیف نے پہلی ہی نظر میں بجانب دیا کو مریضہ کون ہے۔ وہ ناخرہ سے مخاطب ہوا۔

”بیٹی! آپ کا نام ناخرہ ہے شاید“

ناخرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”قرآپ آئیے ذرا میرے ساتھ“

ناخرہ سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھنے لگی۔

ناخرہ کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ جب دو تین لمحے گزر گئے تو راشد نے ناخرہ سے مخاطب ہو کر کہا،

”یہ ڈاکٹر ہیں۔ اور بڑے ہمدرد انسان ہیں“

ناخرہ اٹھ کر بیٹھی اور ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

ڈاکٹر صاحب کیا پوچھیں گے؟ ناخرہ نے سوال کیا۔

”جو مناسب سمجھیں گے پوچھیں گے، جو کچھ ہو گا بہتر ہو گا“

ناخرہ مطمئن نظر نہیں آتی تھی تاہم وہ خاموش ہو گئی مگر ہر ایک کو وہ منٹ کے بعد دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر لطیف کا نوکر چائے کی ٹرالی لے کر آ گیا اور ٹرالی ان کے قریب روک کر چائے بنانے لگا۔ جب چائے پی گئی، ڈاکٹر لطیف اور ناخرہ آ گئے۔

”ڈاکٹر راشد صاحب! ناخرہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ماشاء اللہ بڑی ذہین، عقل مند۔ ڈاکٹر لطیف نے ناخرہ کو بہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ راشد نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میں آپ کی تائید کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب!“

ناخرہ بڑی طرح جھینپ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا اور نہ بہن کے عجیبے چمپ جالے

”چلئے؟ ڈاکٹر لطیف نے ناخروہ سے پوچھا۔

”جی نہیں، میں چلئے نہیں بیروں گی۔“

”نہیں جی چاہتا تو نہ سہی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب! ناخروہ کو ابھی لانا ہو گا۔ آج کا کام ختم“

”بہتر! راشد لے گیا۔“

ناخروہ گاڑی میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے وہ اپنے دل پر ایک درجہ ماحسوس کر رہی

ہے۔ سارا راستہ وہ اس طرح گم سُم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز بھی راشد ناموہ اور ناخروہ ڈاکٹر لطیف کے ہاں وقت مقررہ پہنچ گئے۔

یہ نشست پندرہ منٹ تک رہی۔ تیسرے روز بھی ناخروہ کو جانا تھا۔ ناموہ تیار ہو رہی تھی

کو گھر میں مہمان آگئے۔

”ڈاکٹر صاحب! کل جا میں گئے آج نہیں۔“ ناموہ نے عذرت خواہ لہجے میں کہا۔

”ناخروہ تو نہیں ہرنا چاہئے؟“

”پھر؟“

”میں لے جاؤں گا۔“

”اتنی تکلیف کریں گے؟“

”روز کو نہیں رات۔“

راشد نے ناخروہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے گیا۔ وہ کمرے میں

بیٹھا چلئے پی رات تھا کہ ڈاکٹر لطیف آگیا۔

”ڈاکٹر صاحب!“

”کیسے؟“

”یہ ڈکی ناخروہ آپ کی کوئی عزیزہ تو نہیں، جیسا کہ آپ نے ٹیلیفون پر بتایا تھا۔ میری حال

آپ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں، میں اس سے جو کچھ پوچھ سکا ہوں اس سے میں ایک نتیجہ پر

”بچ گیا ہوں۔۔۔ یہ لڑکی محرومی کا بڑی طرح شکار ہو چکی ہے۔ یہ محرومی دور ہوئی چاہیے:

”کس طرح ڈاکٹر لطیف صاحب؟

”اس کی نگہ میں بچے ہونا چاہیے۔۔۔ یہی اس کا انضباطی علاج ہے:

راشد سوچ میں پڑ گیا۔

”بد قسمتی سے اسے طلاق مل چکی ہے۔۔۔ ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی شادی ایک

بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے: راشد نے اس معاملے کی پیچیدگی واضح کرتے ہوئے کہا۔

”علاج بس یہی ہے۔۔۔ ڈاکٹر لطیف نے جتنی طور پر کہہ دیا۔

”اچھا ڈاکٹر صاحب! میں ذاتی طور سے آپ کا بیحد ممنون ہوں: راشد نے ممنونیت سے

سہرے میں کہہ دیا۔

”چھوڑ دینے ڈاکٹر صاحب! اس FORMALITY کی کیا ضرورت ہے۔۔۔

ناخروہ دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔

”چلو ناخروہ! راشد اس کی طرف جانے لگا۔

وہ اس کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گاڑی کدھر جا رہی تھی، یہ بات ناخروہ کو معلوم نہیں

تھی۔ جب وہ رکی تو اس نے سراٹھایا۔ اس کے سامنے دُور دُور تک وضعت کھڑے تھے چھوٹوں

کے چہرے تھے اور کوئی مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”یہ کہاں لے آئے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ سوال ناخروہ کے ہونٹوں پر آتے آتے نکل گیا۔

راشد نے اپنی جگہ سے اتر کر دوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھولا، ناخروہ نیچے اتر گئی۔

”شاید تم حیران ہو کہ میں تمہیں گھر میں پہنچانے کے بجائے بارغ جناح میں کیوں لے آیا ہوں:

”شاید نہیں یقیناً۔“

”یری مراد یقیناً اُسی سے تھی: راشد نے سکڑا کر کہا ”آؤ ذرا ادھر چلیں: اور راشد ناخروہ کو ایک

نارواں جگہ پر لے آیا اور بیٹھ گیا، ناخروہ کھڑی رہی۔ بیٹھ جائے اور وہ بیٹھ گئی۔۔۔ بچہ پر۔۔۔

اس سے کچھ دُور۔

”فاخرہ! میں ایک سوال کرنا چاہتا تھا“

”جی“

”ذرا یہ بتاؤ تمہارے خیال میں میں کیسا آدمی ہوں؟“

اس عجیب سوال پر فاخرہ نے چونک کر راضہ کو دیکھا۔

”جواب دو“

”آپ — ڈاکٹر صاحب بہت اچھے — یعنی فرشتے ہیں۔“

”نہیں بھئی نہیں، میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں اور انسان ہی دہنا

چاہتا ہوں، تم مجھے انسان یا زیادہ سے زیادہ ایک اچھا انسان کہہ سکتی ہو — اگر پسند کر دو۔
کیا یہ پسند کرتی ہو؟“

”ہوں۔“

”گھبرا میں ایک اچھا انسان ہوں — فاخرہ! کیا تم اس اچھے انسان کا ساتھ دے گی؟“

”جی؟“ فاخرہ کے چہرے پر حیرت و استعجاب کا تاثر پھیل گیا اور پھر یہ تاثر غم و حیا کی
سرخئی میں ڈوب گیا۔

”اسی سوال کا جواب سننے کے لئے میں تجس یہاں لایا ہوں۔“

فاخرہ کو یہ آواز دُور سے آتی ہوئی ٹھنکی ہوئی، اسے لگا جیسے وہ آواز نہروا کے ایک تیز جھونکے میں

پٹی ہوئی آتی ہے اور دُور سے ہی لمحے میں جھونکا کر بس دُور نکل گیا ہے۔ وہ سانسے ایک بلوے
کو دیکھ رہی تھی جس کی پٹھوں بھری شاخیں اہلہا رہی تھیں۔

”مجھے جواب دو فاخرہ! ماشد کی کوازا اس کے کانوں میں گونجی۔ اچانک اس کی نظریں پورے

سے ہٹ کر اس پر پڑیں۔ وہ بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے ایسا کیوں سوچا؟“

”اس لئے سوچا کہ تھیں میں بہت پسند کرتا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں کہ —“ ناخزہ غفرہ مکمل زیرنگی۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں ناخزہ! اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری زندگی بدسرت ہوگی۔ ہم خوش رہیں گے۔“

”ڈاکٹر صاحب! ناخزہ کچھ مضطرب ہوگئی تھی، باجی پریشان ہوں گی۔“

”یہاں سے بیدھا گھر جائیں گے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پیشتر میں نے جو بات سوچی ہے اس کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کر لوں۔“

”میں — کیا — کیا — کہوں؟“

”ٹھیک ہی تمہنے جواب دے دیا ہے۔“ راشد کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ چلنے کی میز پر راشد کی اتنی نارغ ہوگئی تھی، مگر راشد ایک گھونٹ کے بعد مدد تین لمحے توقف کرتا تھا پھر پیالی دوبارہ جوتلوں تک لے جاتا تھا۔ اس تین چار بار گنگھیوں سے اسے دیکھ چکی تھی بیٹے کا یہ انداز اس کے لئے خلاف معمول تھا۔

پیالی شاید نصف کے قریب ہی خالی ہوتی تھی کہ راشد نے اسے میز کے اوپر رکھ دیا۔ لیکن اسے منہ پونچھا، اس اس وقت بھی اسے گنگھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

”راشد بیٹا!“

”کیسے اتنی؟“

”کیا ہوا تمہارے اس کیس کا، وہ نا — نفیاتی کیس؟“

راشد بے خیالی میں دوبارہ منہ پونچھنے لگا۔

”وہ — ٹھیک ہے، ڈاکٹر لطیف نے اپنا شہرہ دے دیا ہے۔“

وہ اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ اس اس سے پہلے اٹھ بیٹھی تھی مگر اس روز بیٹھی رہی۔

”امی!“

”کہو۔“

”مجھے کچھ۔ آپ سے کہنا ہے۔“

”میں جانتی تھی آج میرے بیٹے کو کچھ سے کوئی بات کہی ہے، انتظار کر رہی تھی۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟“

”بیٹا! بعض باتیں بغیر کسی خاص وجہ کے معلوم ہو جاتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے کہو۔“

”شعبہ میٹھ گیا۔“

”اتنی! میں اس لڑکی سے خاوری کرنا چاہتا ہوں۔“

”اتنی نے کرسی پر پہلو بدلا۔“

”کس لڑکی سے بیٹا؟“

”ناخروہ سے۔“

”ناخروہ۔۔۔ یہ وہی لڑکی تو نہیں جو نسیاتی۔۔۔“

”جی اتنی!“

”اتنی اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر پھیرنے لگی۔“

”اتنی! اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی دلیل ہے۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ

میں ایسا چاہتا ہوں، اس میں بری خوشی ہے۔“

”بڑی آکھیں جو زندگی کے بے شمار رنگ دیکھ چکی تھیں اپنے بیٹے کا ایک ایسا رنگ

دیکھ رہی تھیں جو اس کی قریح کے خلاف تھا لیکن اس کا کہن سالہ تجربہ بتا رہا تھا کہ بیٹے کے

اس رنگ کے پیچھے اس کے دل کا عزم اور قوی ارادہ کارفرما ہے۔ برلی،

”تم نے اپنی رفیقہ حیات کا انتخاب کر لیا ہے!“

”جی اتنی!“

”میں یہ نہیں پرچھوں گی کہ تم نے اس لڑکی میں جو بقول تمہارے اپنے ایک نسیاتی مریضہ

ہے کیا خوبیاں دیکھی ہیں۔ تم کہوں اس کی ذات سے متاثر ہو گئے ہو۔ اشارہ اللہ عطا کند ہو۔
اپنی بھلائی بڑائی خوب سمجھ سکتے ہو۔ فقط ایک سوال کروں گی۔ میں کرب کی ماں کو کیا جواب
دے سکتی ہوں؟

”ماں نے وہی سوال پوچھا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اس نے دیکھتی رنگ پر ہاتھ
رکھ دیا تھا۔

”یہ نہیں اتنی! کہ میں نے اس پر غور نہ کیا ہو۔ غور کیا ہے۔ مگر دیکھئے ناکوب کا بڑا
خوشحال گھوڑا ہے شادی ایسے گھرانے میں کوئی پرالیم نہیں بن سکتی۔
”کچھ جذباتی باتیں بھی ہوتی ہیں بیٹا! عدلت ہر مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔
”جذباتی باتیں تو۔۔۔ اتنی! جذباتی باتیں کیا ہوں گی۔“ اس نے اپنی طرف سے
ندامت بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں تم نے ان پر غور نہیں کیا ہو گا۔ بہر حال میرے لئے یہی دلیل کافی
ہے کہ اس میں میرے بیٹے کی خوشی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔“ ٹھیک ہے۔
راشد کی نظر زواری کھاک پر پڑی۔ پونے نو سو چھ تھے۔ اسی لباس پہنا ہے۔ وہ
اوپر چلنے لگا۔ ان دیش میٹھی رہی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد نیچے آیا اور بولا۔
”اتنی! آپ بات کریں گی وہاں۔“ یعنی۔۔۔ خازنہ کے گھر جا کر۔
”یہ بات بھی تمہیں کہنا چاہیئے تھی؟“
راشد کچھ محجوب ہو گیا۔

میں جانتا ہوں میری اتنی بہت ہی پیاری اتنی ہے۔“ اردو بے اختیار ماں سے پٹ گیا۔

○

ماڈرے فورج چکے تھے۔ بیکنگ کو سمول کے مطابق کوہ گھنٹ پہلے بند ہو جانا چاہیئے تھا
مگر اس شام سریفوں کا رخص کچھ زیادہ تھا۔ راشد شک چکا تھا اس نے اپنے کمپنڈر کو زواری
”خاص! کوئی ہے؟“

فیاض اذرا آگیا۔

”سرا! ایک خاتون منجی ہے۔“

”بیچ دو اسے۔“

فیاض ڈپٹری میں واپس چلا گیا۔

راشد پیشانی دایں ہاتھ سے لٹکائے اور بائیں کہنی میز پر ٹکائے مضطرب انداز میں بیٹھا تھا کہ اسے کپڑوں کی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

”قرایے کیا تکلیف ہے؟ اس نے مرلیض کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر کہا۔

”بہت تکلیف ہے ڈاکٹر صاحب؟“

یہ آواز سننے ہی راشد نے بے اختیاری کے عالم میں اپنے سامنے دیکھا۔ کوکب مرلیض کے شول پر بیٹھی تھی۔ ایک خوبصورت اور قد قمتی ساڑھی میں لبوس، نیلی آنکھیں جن میں بڑی عمرانی تھی۔

”کوکب — تم: یہ کیا ذاق ہے آخر اس طرح آنے کی ضرورت کیا تھی؟“

”مرلیض اسی طرح ہی تو ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، بتائیے اور کس طرح آتا ہے؟“

راشد نے اپنے ہاتھ کھٹکے اور اسے کوکب کو خاموش رہنے کے لئے کہا اور کہہ پھڑک کر بلا کر کہا کہ وہ تار چابیاں میز پر رکھ کر چلا جائے۔ وہ یہ حکم سن کر چلا گیا۔

”آج آپ کی فنی آئی تھیں — اور انہوں نے وہ کچھ بتا دیا تھا جس کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ کوکب نے اپنی ستر تم انداز میں یہ الفاظ کہہ کر ایک خاص توقع کے ساتھ راشد کو دیکھا۔

”کوکب! کیوں آخر اس کی توقع کیوں نہیں کی جاسکتی تھی؟“

”اس لئے نہیں کی جاسکتی تھی کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر کا کام مرلیض کا علاج کرنا ہے۔“

”کوکب! میں اس کا علاج ہی کر رہا ہوں؟“

”کیا اس طرح بھی علاج ہوتا ہے؟“

”کوکب! یہ زمین کے مرض پر منحصر ہے کہ اس کا علاج کس طرح ہو۔ تم نے دوست کہا ہے کہ یہ خلاف توقع علاج ہے۔ مگر بعض مرض بڑے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان مریضوں کی شفا یابی کے لئے عوامانہ کی نہیں انسانی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ راشد نے عزیز جذباتی لہجے میں کہا۔

”کوکب یہ الفاظ سن کر بے چین سی ہو گئی۔

”اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جائے۔“
 ”غیر انسانی سلوک کس کے ساتھ کیا ہے میں نے؟“ راشد نے خوراً استفسار کیا۔
 ”مثلاً۔۔۔ میرے ساتھ۔“

”غلط۔۔۔ میں نے کبھی تم سے شادی کا عہدہ بیان نہیں کیا۔ میں یہ پورے دھوکے سے کہہ سکتا ہوں۔“

”راشد صاحب! کوکب نے اب اسے اس کے نام سے مخاطب کیا عہدہ بیان صرف غفلتوں ہی سے نہیں اٹھاؤں، کتابوں اور دونوں سے بھی پابندی جاسکتے ہیں۔“
 ”یہ بھی نہیں ہوا۔“

”ہوا ہے۔ راشد! ایسا ایک بار نہیں کہی بار ہوا ہے۔ یاد ہے آپا لندن سے آرہی تھی اور ہم لوگ اسے ریوکر نے ایرپورٹ پر جا رہے تھے، میں تہلہ لگاڑی میں بیٹھی تھی اور تم گلاڑی بڑی تیزی سے چلا رہے تھے، میں نے کہا تھا آہستہ چلائیے، ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اور تم نے کہا تھا تہلہ میرے ساتھ مزاجی خوش قسمت ہے۔ اور جب تم نے لمبی بی ایس کا آخری پرچہ دیا تھا تو میرے پاس آٹے تھے اور کہا تھا: کوکب! ذرا گرمی کا لباس ہو جاؤں۔ میں نے کہا تھا: ایری! ذرا سے بھلا کیا ہو گا۔ تم نے جواباً کہا تھا: میرے لئے تم جو بھی دھاکہ دگی قبول ہو جائے گی۔ یاد ہیں یہ باتیں؟“

یاد میں: راشد نے کہا

”اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ ایک بار میں اور تم کو آؤنگ کر کے گھر آئے تھے تو تمہاری اتنی لے
کہا تھا، راشد بڑے خوش نظر آتے ہو۔ اور تم نے کہا تھا: آج میں بچہ خوش ہوں۔ تم سکوٹنے
لگے تھے اور میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کوکب دو لمبے ٹک کر بولی: راشد!
یہ سب کچھ کیا تھا، کیا تم نے مجھ رکھا تھا کہ مجھ پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ میرے اندر
احساس کی کوئی قوت نہیں ہے۔ میں احساسات سے بے بہرہ ہوں۔ میں توقع نہیں بناؤ
سکتی۔ میں خواب نہیں دیکھ سکتی؟“

راشد نے کوکب کی جذباتی بات بڑے تحمل سے سنی اور بولا:
”کوکب؟“

کوکب نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

”یہ سب کچھ ایک طرف ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کوکب! میں نے تم سے کوئی امید باندھنے، کوئی خواب دیکھنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ یہ جہاں
اپنا معاملہ ہے۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔“

”مجربا یہ میری غلط فہمی تھی؟ کوکب نے پوچھا

”میں یہ بھی نہیں کہتا۔ فقط یہ کہتا ہوں کہ میرا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے۔“

کوکب نے ان آنکھوں سے اسے دیکھا جن میں آنسو آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ
جلدی سے اٹھتی اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

راشد نے اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے اور تنہا بیٹھا رہا۔ — دیر تک بیٹھا رہا۔

شادی کی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں انجام پائی۔ راشد کے کچھ ڈاکٹر دوستوں نے شرکت
کی اور وہیں کی طرف سے اس کے چند عزیز آئے اور جب وہیں نے پہلی مرتبہ راشد کے مکان

کی دلہیز پر قدم رکھا تو اس کی ساس نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ ناخوہ کر
ان بازوؤں میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت وہ ان لمحوں میں محسوس کرتی
تھی جب بچپن میں اس کی ماں اسے گود میں اٹھا لیتی تھی۔

ناخوہ کی حالت میں ایک واضح طور پر بغیر آواز کے تھا۔ پہلے اس کا صبح و شام کام یہ ہوتا تھا
کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر چادر یا لاری میں خود کو مقید کر لے اور کتابوں کا مطالعہ کرتی رہے۔
گھر کے کاموں میں وہ بہت کم دلچسپی لیتی تھی۔ تفریحی مشاغل سے تو اسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا
لیکن اب وہ بڑے شوق سے اپنی ساس کا ہاتھ بٹائی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا کر
بھی گھر پر جاتی تھی۔

اگرچہ وہ وقت آگیا جب اس نے اپنے اندر کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی محسوس کی۔
اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ کھڑکی میں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شوہر
کو آنے دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔

ماشا اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔

”کیا دیکھ رہی ہو ناخوہ؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ مجبور ہوئی جا رہی تھی۔

”شاید چاند کو دیکھ رہی ہو۔ عورت کی اپنی گود میں جب چاند آنے والا ہوتا ہے
تو اسے آسمانی چاند سے بڑی دلچسپی ہو جاتی ہے۔“
ناخوہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

وقت مقررہ پر ناخوہ کی گود ایک بڑی پیادہ اور خوب صورت بچی سے بھر گئی۔ ساس
خفے وجود نے گھر کی رونق کو بہت بڑھا دیا تھا ناخوہ کا ماضی محض ایک خراب بن کر رہ گیا
تھا اور بلاشبہ بڑا خوش تھا کہ اس کا ایثار و اینٹھن نہیں گیا۔ اس نے اپنی قربانی سے ایک
ایسی لڑکی کی اداسیوں کو دور کر دیا ہے جو زندگی کی ساری خوشیوں سے ایسے ہی بچی تھی۔ اور

جو اپنی زندگی کو زندگی کی سزا قصود کر رہی تھی۔

جیسے جیسے ناخوہ اور راشد کی بچی ٹینڈ کی عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی خوبصورتی بھی بڑھتی جا رہی تھی، وہ جب اپنی توہلی زبان میں کوئی بات کہنے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی ماں کا چہرہ وغیرہ مسرت سے گلزار ہو جاتا تھا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے یوں چار سال کی مدت بیت گئی۔

ٹینڈ خامی صحت مند بچی تھی۔ کبھی کبھی اسے بچوں کی عام تکلیف ہو جاتی تھی اور ماں باپ کی توجہ سے تھوڑی دیر بعد دور ہو جاتی تھی۔ اور اس شام جب ناخوہ نے اس کا بدن خدا گرم دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ کیونکہ اس کے پہلے بچے کا جسم بھی اسی طرح گرم ہو گیا تھا، اس نے بیکنگ میں راشد کو نوٹن پر اپنی بچی کی کیفیت بتائی اور اسے باعراہ جلد آنے کہینے کہا۔ راشد نے اسے تسلی دی۔

”مکومت کرو ناخوہ! موسم بدل رہا ہے۔ یہاں بھی بہت سے بھار میں مبتلا لوگ آنے چلے۔ مگر ناخوہ نہ جانے دل میں کیسا خوف غموس کر رہی تھی کہ اسے ٹینڈ کے پاس بیٹھے ہونے چہین ہی نہیں آتا تھا، اس کی ماس نے بھی ہر چند تسلی دی لیکن وہ مضر تھی کہ راشد کو خدا آجانا چاہیے، ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور ادھر راشد بیوی کے بار بار ٹیلیفون آنے پر حرف بھی کہے جا رہا تھا۔

”ناخوہ! اتنے سرلیض چھوڑ کر میں کیسے آسکتا ہوں اور پھر کوئی ٹنڈ کی بات ہو جب ناخوہ فوجیہ راشد آیا، کھانا کھانے سے پہلے اوپر کمرے میں گیا۔ ناخوہ ٹینڈ کو گود میں لئے کمرے کے اندر ٹھیل رہی تھی، اس نے بچی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی گرم تھی۔

”جلدی کیوں نہیں آئے؟ ناخوہ کا لہجہ تلخ تھا۔

راشد نے قہقہے سے کام لیا۔

”تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو۔“

”خواہ مخواہ پریشان ہو گئی ہوں — بدن کرنے کی طرح نہیں چل رہا — مرض چھڑ کر نہیں آ سکتے تھے — انہیں دوسرے روز نہیں دیکھ سکتے تھے — بری بچی کی حالت — میں نے بتایا نہیں تھا کہ بیمار ہو گئی ہے — نہیں اپنے مریضوں کی پڑی رہی — اس سے بے پروا ہو گئے —“

”نہیں ایسی بات نہیں ناخرہ آراشد نے بچی کو بیوی کی گود سے اٹھا کر اپنے سینے سے دگایا۔

”شام سے نہ سکاوتی ہے نہ کھلونوں سے کھیلتی ہے“ ناخرہ نے منظر یاد کہا۔

”بس یہی بات ہے — کمال کرتی ہو — بچوں کی طبیعت نرم گرم ہوتی رہتی ہے۔ ابھی مکھڑے گی، کھلے مانگے گی، ہنسنے لگی، تھپتھپانے لگی، دیکھتی جاؤ کیوں گلڑیا، ٹھیک کر رہا ہوں نا؟“

راشد خیمہ کو گھڑیا کہا کرتا تھا۔ اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا تو اسے قہقہے مٹتی کوٹھید حذر دیکھ نہ کچھ کہے گی، مگر وہ چپ چاپ باپ کے کندھے سے اپنا سر لگائے خیمہ دا آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔

راشد بے اسے دوا پلائی۔ دوا کے بعد لگا تھا کہ اس کی پہلی سی حالت عود کر آئی ہے۔ لیکن وہ پھر ویسی کی ویسی ہو گئی۔

ناخرہ نے اسے بار بار بلایا۔ اور وہ خوب صورت گلڑیا اس کے پاس پلنگ کے اوپر رکھ دی جسے وہ چند روز پیشتر اس کے لئے خرید کر لائی تھی اور جسے اس نے بچہ پسند کیا تھا۔ ٹیسنے نے گلڑیا کو آغوش میں لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

گیارہ بجے کے قریب اسے تپے آگئی اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ راشد کے اسے انکسٹن دگایا تھوڑی دیر بعد ایک اور تپے آگئی۔

ناخرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مسلسل تپے جا رہی تھی۔ راشد کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں

آرام تھا۔ اس کی انی بھی لوہا پر آگئی تھی۔ بچی کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ راشد نیچے گیا۔ اس نے اپنے ڈاکٹر دوستوں کو فون پر جلد آنے کی تاکید کی اور دو ڈاکٹر آ گئے۔ وہ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا۔ مگر صبح چار بجے ٹینڈ کا جسم پیشے کے لئے بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

ناخزہ کی حالت ایسی تھی کہ فرط مایوسی سے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی جیسے غرت گویانی سے محروم ہو گئی ہے وہ دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔

راشد نے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا:

”انی! اسے نیچے لے جاؤ۔“

ماں ناخزہ کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:

”آؤ بیٹی!“

ناخزہ چلنے لگی۔ یکایک وہ ڈگ گئی۔ ٹینڈ کے پنگ کی طرف آنی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ گزرا یا کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے گزرا یا اٹھالی اور سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر خود بخود سیز ڈھیروں سے اترنے لگی۔ اس کی سانس پھپھے چھپے جانے لگی۔ ناخزہ ایک کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ سانس چند منٹ بعد لڑے پر ڈک کر لے دیکھتی رہی۔ ناخزہ نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ اُد پر آ گئی۔

جھیزہ عظیمین کا کام بڑی خاموشی کے عالم میں ہو گیا۔

ٹینڈ کو گلے ہونے لگی گھنے ہانڈ پہنکے تھے اور ناخزہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک نہیں گرا سکتا اور یہ صورت حال خطرناک تھی۔

سارے گھر میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ناخزہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔

گزرا یا اس کی گرد میں تھی۔ راشد دو تین بار اپنی ماں سے کہہ چکا تھا۔ انی! اسے زلاؤ۔ ماں نے جب آخری بار بیٹے سے یہ لفظ سنے تو ناخزہ کے پاس نہ بیٹھی

”ناخروہ! تمہاری ٹینڈ مر گئی ہے۔“

ناخروہ نے ساس کو دیکھا اور سر جھٹکالیا۔

”ناخروہ بیٹی! ٹینڈ مر گئی ہے۔ — راشدی گڑیا مر گئی ہے۔“

اس کا بھی وہی رد عمل تھا۔

اس کی ساس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اس نے بہو کی گود سے گڑیا لینے کی کوشش کی۔

یہ ایک ناخروہ تڑپ اٹھی۔ اس نے گڑیا ساس کے ہاتھ سے چھین لی اور نہ نہ کہتی ہوئی اسے گلے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ اب آنسوؤں کا سبب تھا کہ تھکے کا نام ہی نہیں بت تھا۔ آٹھ دن گزر گئے۔

ناخروہ معمول کے مطابق ساس کا ہاتھ بٹانے لگی اور جب بھی اسے کانوں سے فرصت ملتی

تھی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گڑیا کو گلے سے لگا کر رسی میں بیٹھ جاتی تھی اور دیر تک اسی طرح بیٹھی رہتی تھی۔ خیالوں میں گم نہم — کھوئی کھوئی سی۔

ساس نے موقع پا کر گڑیا چھپا دی تو وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس آگئی۔
”اماں! وہ تو نہ جھینس —“

”وہ کیا ناخروہ بیٹی؟“

”وہ — میری گڑیا۔“

اماں نے اسے گڑیا سے دی۔

اماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اور ایک روز وہ اپنے بیٹے کو بتائے بغیر بہو کو ہسپتال میں لے گئی۔ ایڈی ڈاکٹر نے چیک کیا اور اسے یہ اذیت ناک خبر سنائی کہ خالد جان! آپ کی بہو کے اندر کچھ ایسی طراپی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر آئندہ بچہ ہوا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اماں نے یہ خبر سن کر بتائی تو اس کی بھٹک ناخروہ کے کانوں میں بھی بڑ گئی اور اس پر گھیا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

اس چھوٹے سے گھر میں اب ایک دوسرے سے الگ الگ اور کافی فاصلے پر دو جزیرے سے آباد ہو گئے تھے۔ ٹکرواؤں بٹشکی لہریں اٹھ اٹھ کر دم بدم ان سے ٹکراتی تھیں اور ان کے درمیان دُوری کسی صورت بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ راشد کے لئے یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنی کشتی بھی ایک جزیرے تک لے جاتا تھا اور بھی دوسرے جزیرے تک، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دُوری جو پیدا ہو گئی ہے وہ کسی خاص واقعے کے بغیر ختم نہیں ہو سکتی۔

ماں دبے دبے نظروں میں بیٹے سے کہہ دیتی تھی کہ گھر کی دیرانی کے تم خود فیسے داد ہو۔ راشد ادا کا اشارہ سمجھ لیتا تھا لیکن ناخرہ کو وہ اس کے حال پر چھوڑ کر ازمیر لو اپنا گھر بدلنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ناخرہ پہلے سے بھی کم بولتی تھی، ایک بار وہ شام کے وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو راشد نے بڑی محبت سے پوچھا:

”ناخرہ! تم کیا فضاؤں میں دیکھتی رہتی ہو۔“

وہ اسی انداز میں کھڑکی دہی اور کہنے لگی:

”دیکھو راشد! وہ چاند کی موٹی، وہ بادل، وہ افق کتنی دور ہے۔۔۔ اور انسان کے ہاتھ کتنے چھوٹے ہیں۔“

”تو میں ان سے کیا دلچسپی؟ — پکڑنا چاہتی ہوں انہیں؟“

”ہاں۔“

”ناخرہ! پاگل ہو گئی ہو؟ راشد نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا

ناخرہ کی آواز گھوگر ہو گئی، بولی:

”ہاں، میں پاگل ہو گئی ہوں — میں کہاں، وہ کہاں، جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کوشش پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے — مجھے جو کچھ نہیں مل سکتا — وہ ایسے ملے گا۔ وہ نہیں ملے گا۔“

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

راشد اسے ہر طرح تسلیاں دیتا رہا اور وہ مسکیلیں بھرتی رہی۔ ایک اندر دنی پہلے
سے متواتر کاغذی رہی۔ اور ہلنگ پر گر پڑی۔

کوکب کو اتنے برسوں بعد اپنے گھر میں دیکھ کر راشد حیران رہ گیا۔
وہ پہلے جیسی تھی۔ خوب رو، رنگ سرخ و سفید، گہری نیلی آنکھیں۔
”راشد صاحب! آپ نے میں اپنی شادی پر بلایا ہی نہیں تھا۔ ہم بھی ناراض ہو
گئے تھے۔“

اس سے پیشتر کہ راشد کچھ کہے اس کی ماں بولی،
”کوکب بیٹی! اتنی مدت کہاں رہیں؟“

”پشاور میں، خالد جان! ان کا تبادلہ وہاں ہو گیا تھا۔“

شکوہ شکایت کی باتیں ہونے لگیں۔ کوکب فاخرہ سے مل کر بہت خوش نظر آتی تھی۔
سکراسکا کو اس سے گفتگو کرتی رہی۔ راشد کلینک چلا گیا اور فاخرہ باورچی خانے میں کھانے
وغیرہ تیار کرنے لگی تو اس کی ساس نے کوکب کو سارے حالات بتا دیے۔

”بیٹی! میری دنی تنہا تھی کہ اس گھر میں تو آئے۔ مگر راشد کے سر پر ایسا دکھ جنوں سوار
تھا، میں کیا کرتی۔ اب گھر ویران ہو گیا ہے۔ ہر طرف وحشت برستی ہے۔ دن
رات ایک شانا سا طاری رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ویرانی کیسے حد ہوگی
۔ یہ قبر کا شانا کیونکر ختم ہوگا۔ یہ زندگی۔ زندگی نہیں، موت سے بدتر ہے۔
لگتا ہے ہم کسی اندھے کنویں میں گر پڑے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس کی ٹوڑھی آنکھوں سے
آنسو گرنے لگے۔“

کوکب نے ساری باتیں خاموشی سے سنیں اور بولی،

”خالد جان! مجھے راشد سے کوئی شکایت نہیں۔ میری زندگی مطمئن ہے۔“

”مگر ہماری حالت — بیٹی؟“

”کوکب کچھ سوچ میں پڑ گئی، چند لمحوں کے بعد بولی،

”ویسے خالہ جان! آپ کی ہوسو بڑی پیاری ہے۔“

”پیاری تو ہے، پر —“

”خالہ جان! بعض چیزوں پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔“

دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب کوکب جانے لگی تو ناخزہ سے کہنے لگی،

”اب آپ لوگوں کو ہمارے یہاں آنا ہو گا۔ میں راشد سے ٹیلیفون پر دن مقرر

کروں گی۔“

○

جمعہ کی شام کو کلینک بند تھا اور یہ شام راشد کی اپنی تھی۔

وہ اور ناخزہ جب کوکب کے بچلے پر پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور مگر محبتی سے

دونوں کا خیر مقدم کیا۔ خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی ناخزہ کو جب معلوم تھا کہ کوکب راشد

کی کلاس میں ملو تھی اور اس کی ذات میں بڑی دلچسپی لیتی رہی تھی۔ اس کی اور اس کے والدین

کی بڑی خواہش تھی کہ وہ راشد کے ہاں دہن بن کر جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو ناخزہ کو توقع تھی

کہ وہ دل ہی دل میں اس سے شاک ہوگی لیکن ویسے ویسے کا اظہار نہ تو اس نے ناخزہ کے

یہاں کیا تھا اور غائب اپنے گھر میں کر رہی تھی اور ناخزہ کو اس پر حسرت تھی۔

ساڑھے دس کا وقت ہو چکا تھا اور کوکب کے مہمان اپنے گھر جانے سے پہلے آخری بار

چائے پی رہے تھے۔ کوکب سادہ وقت خرب خوب بچکی تھی اب خاموش تھی۔

ناخزہ نے خالی پیالی میز کے اوپر رکھ دی اور اٹھنے لگی تو کوکب اس کے پاس آگئی۔

”ناخزہ! کیا میں ایک بھی بہن نہیں ہوں؟“

ناخزہ اس سوال پر گھبرا گئی۔

”یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ اس نے اپنی طرف سے سوال کر دیا۔“

”میں نے اس کی خدمت محسوس کی ہے۔“

راشد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”خاخرہ! کوکب نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دے دو۔“

”کیا جواب دوں! — بڑی اچھی ہیں۔“

”بہن کی طرح نا؟“

”کیوں نہیں؟“

”تو مجھے اپنی بہن سمجھتی ہو — اسی ایک بہن اپنی بہن کو کچھ دے تو بہن خود غشی سے جہول کر جیتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے کوکب کمرے سے نکل گئی اور جب لڑکی تو اس نے اپنے بازوؤں میں اپنی سوتلی بہن ایک سالہ بچی کو سمیٹ کر اٹھا۔“

”یہ آئینج سے قہادی بچی ہے۔“

خاخرہ کوکب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ راشد اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا۔

”میرے شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں — کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔“

کوکب خاخرہ کے قریب ہو گئی — اور قریب ہو گئی اور بچی اس کی باتوں کے حوالے

کر دی۔

کوکب! اتنا دبا بہت بڑا احسان ہے لیکن ایسا ہو گا کیسے؟ راشد نے پوچھا۔

”کیا میں نے بتا نہیں دیا کہ میرے شوہر اور اس کے عزیزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”میرے مدد پر تو اور حسد ہے میں — میری یہ بچی میرے اپنے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں۔“

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کوکب! صرف یہی نہیں اور بھی کئی باتیں ہیں۔“

کوکب ”دو تین لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی،

”جھیک ہے کچھ اور باتیں بھی ہیں — مثلاً بچی ماں سے جدا کیسے ہو سکتی ہے؟ اتفاق یہ

ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ مانوس نہیں ہے۔ مانوس ہے اپنی آیا سے، جو اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ یہ آیا بچی کے ساتھ ہی جائے گی:

ناخزہ چاند میں اپنی ہونٹیں لٹکی کرگود میں لے لے کھڑی تھی۔

”یہ میرا تختہ قبول ہے؟ کوکب نے مسکرا کر پوچھا۔“

”جی ہاں ناخزہ کے ہونٹوں سے صرف یہی ایک لفظ نکلا۔“

”یہ آج سے آپ کی ہے۔ میں آیا نہیں کر دوں گی۔“

”کیوں نہیں آیا کریں گی؟ یہ آپ کی ہے۔“ ناخزہ نے کہا۔

”میری شہس ناخزہ بہن! آپ کی۔“ کوکب نے ناخزہ کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گھڑی میں بیٹھے وقت کوکب نے بچی کی پیشانی چوم لی جس سے وہ جاگ اٹھی اور رونے لگی۔ جلدی سے آیا نے اسے گود میں لے لیا، اور وہ چپ ہو گئی۔

”انی! ہم ایک تختہ لے کر آئے ہیں، راشد لے کرے میں داخل ہوتے وقت ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔“

”تختہ! — کیا تختہ؟“

”وہ تختہ انی! جو ناخزہ کے لئے ہے، میرے لئے اور آپ کے لئے بھی، جس سے اس گھر کی

ساری بوردیت دور ہو جائے گی، جس سے اس گھر میں رونق آجائے گی۔“

آیا اندر آگئی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ انی نے پوچھا

”دیکھ لیجئے انی!“

تیا نے بچی انی کی طرف بڑھادی، انی اسے گود میں لے کر حیران نظروں سے بٹے کو دیکھنے لگی

”انی! یہ آج رات سے پہلے کوکب کی تھی، آج ناخزہ کی ہے، یعنی ناخزہ اس کی ماں ہے۔“

میں باپ اور آپ مشفق داری جان۔

راشد نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔

”کتنی بڑی قربانی؟ انی کے منہ سے بے ساختہ نکلا

”یہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔“

”بیٹا۔“ اسی بیٹے سے کہنا چاہتی تھی کہ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس نے کیا

کیا۔ مگر وہ خاموش ہو گئی۔

راشد نے پوری سے کہا کہ بچی کیسں جاگ نہ پڑے اسے اوپر لے جلئے اور فاحرہ اسے

گود میں لے کر اوپر جانے لگی۔ جب اس نے آدھی سیز دھیاں طے کی ہوں گی کہ انی بولی،

”راشد! یہ تمہاری پوری کچھ خوش نظر نہیں آتی۔“

”نہیں انی! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اس کے دل کی کیفیت سمجھ نہیں سکتیں۔ کبھی کبھی

خوشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

انی مطمئن ہو گئی۔

بچی فاحرہ کے پیلو میں سروری تھی اور راشد اپنے پلنگ پر لیٹ چکا تھا۔

”فاحرہ!“

”جی۔“

”کیا یہ سچہ نہیں ہے۔“ کتنا اشارہ ہے یہ۔“

”راشد صاحب! میرا خیال ہے اس وقت آپ کو بہت افسوس ہو رہا ہو گا۔ آپ

بڑے پریشان ہوں گے۔“

”کس بات پر فاحرہ!“

”آپ ہنسے کیوں نہیں۔ آپ کی انی بھی یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تم نے کوکب کو نظر انداز

کر دیا اور اس نے۔ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ایک حقیقت ہے۔“

راشد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

’جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔ مجھے اس پر کوئی افسوس، کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ مجھ لیا۔‘

’شکریہ‘

’اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کہتے ہوئے راشد کی نگاہ بچی پر پڑی جو اسے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

’کتنی پیاری ہے، ناخروہ! معلوم نہیں کو کب نے اس کا کیا نام رکھا ہے۔ ہم اسے ’ٹینڈ‘ کہیں گے۔‘ ناخروہ خاموش رہی، اس نے اپنی رضامندی یا غیر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔

○

راشد دیکھ رہا تھا کہ ناخروہ ٹینڈ کی ذات میں بہت کم چپچی لے رہی ہے۔ اس کی ماں کا بھی یہی احساس تھا۔ دونوں اُس کے رویے پر پریشان تھے مگر صبر و تحمل کا ثبوت دے دے رہے تھے۔ امی ناخروہ کی غیر موجودگی میں اپنے بیٹے سے بہو کے بچے کے ساتھ اہل خیر و اہل سلوک پرکڑھتی تو راشد اسے دلزدہ کرنے کا مشورہ دیتا بلکہ درخواست کرتا کہ وہ مزید انتظار کریں۔ ناخروہ کا رویہ آہستہ آہستہ درست ہو چلنے لگا۔

ٹینڈ بیشتر وقت آیا ہی کے پاس رہتی، وہی اسے دودھ پلاتی، نہلاتی، کپڑے بدلتی، اپنے ساتھ سلاتی، ناخروہ کبھی اسے گود میں لیتی بھی تو ناگہاری کے عالم میں، اور اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اسے جلد اپنی آغوش سے نکال دے۔

اُس روز انہی کسی چودھن کے گھر سے واپس آئی تو دیکھا کہ بچی کمرے میں تھما رہی، اس نے رو رہی ہے، آیا باورچی خانے میں ہے۔ اور ناخروہ غائب ہے۔ وہ اوپر بڑبڑاتی تو پتا نہ چلا کہ کونسی میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے اور اس کی گود میں غڑ باری ہے۔

یہ منظر دیکھا اس کے اندر ایک سخت غصے کی آگ بجڑک اٹھی، پہنچ رہی،

”ناظرہ! تمہیں معلوم نہیں کتنی نیچے بڑی طرح رو رہی ہے؟“

”تو اس کی آیا کہاں ہے؟“

”اس کا خیال رکھنا صرف آیا ہی کا فرض ہے؟“

”ہاں ناں جان، کوکب نے اسے اسی فرض سے ساتھ بھیجا تھا۔ ناظرہ نے جواب دیا۔“

”اور تمہارا کوئی فرض نہیں؟“ — کسی سنگدل ماں ہو! کتنی دور رو کر ہنگام رو رہی ہے

اور رقم اور پر مرنے سے کتاب بڑھ رہی ہو۔ کیا کوکب نے اپنے جگر کا ٹکڑا اس لئے تمہارے

حوالے کیا تھا کہ اُس سے ایسی طامانہ بے نیازی برتو۔ اس نے تو رقم پر دم کھاکر اپنی کتنی

دی تھی۔“

ناظرہ نے ٹرٹی سے اٹھتے ہوئے کتاب اور ٹکڑیا پانی پر دکھ دیں۔

”اناں! میں نے اُس سے رحم کی درخواست نہیں کی تھی۔“

”احسان کا بدلہ تو چکایا جاتا ہے!“

”اس نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیا ہے تو آپ لوگوں پر کیا ہے؟“

”ماں تم ہو اس کی۔“

”میں اس نہیں ہوں۔ ناظرہ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔“

اتنی کا چہرہ اور مفرخ ہو گیا۔

”کیا کہتی ہو؟“ — تمہاں نہیں ہو۔ کوکب نے تمہیں کیا مجھ کراپنی کتنی دی تھی۔؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔“ — یہ حلال میں اس کی ماں نہیں ہوں۔ اس نے میری کوکھ سے

جہنم نہیں لیا۔ اس کی دلوں میں میرا ہو نہیں ہے۔ یہ میرے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ میں

اسے کیسے اپنی کتنی مجھ کو گود میں لے لوں۔ میں کیا گنتی ہوں اس کی۔ قسمت کو یہ منظور نہیں

ہے کہ میری گود میں میرا اپنا بچہ ہو۔ دونوں بچے اس نے چھین لئے۔ کیا اب میں غیروں

نے آگے باز دھکیلاؤں کہ خدا کے لئے میری گود بھردہ۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔ اناں! میں اس

کے لئے تیار نہیں ہوں۔

ناخزہ ان لمحوں میں بھروسہ لگاتی تھی کہ اس سے مخاطب کون ہے۔ جو کچھ دل میں آتا تھا وہ سچے سچے بغیر کچے جا رہی تھی۔

”اور تم اس کے لئے تیار ہو کر اس بے جان گویا کو اپنی گود میں سجانے دیکھو۔ اتنی نے غضب ناک نظروں سے تپائی پر پڑی ہوئی ٹھٹھکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔“

”اے۔۔۔ یہ میری بچی کی تھی۔“
”اور وہ زندہ بچی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“
”یہی سمجھ میں؟“

”کیا؟ اتنی کے غصے کا پارہ بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اٹھایا اور اسے گھر کی سے باہر پھینک دیا۔“

”اے۔۔۔ ناخزہ کا جسم رزنے لگا۔ وہ دم سے گرمی کے لوہے پر گر پڑی۔
”ایا بچی کو گود میں اٹھانے لوہے پر آجی تھی۔ ناخزہ کو اس طرح لگتے دیکھ کر
آئی اور بلبل۔۔۔ بی بی کہنے لگی۔“

اتنی یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے ناخزہ کا ہاتھ پکڑ کر دو تین بار ناخزہ !
ناخزہ !! کہا۔ ناخزہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

اتنی نے آیا کو وہیں ٹھہرایا۔۔۔ سڑ بھروسے سے نیچے اُتری۔۔۔ اے۔۔۔ میں بیٹے کو
صوبت حال سے مطلع کر دیا۔

راشد کے آنے تک ناخزہ کے سر سے کافی ہوسہ چکا تھا۔ راشد نے اس کے سر پر پٹی
باندھی اور اسے پنگ پنگ دیا۔

دو گھنٹے کے بعد اس کی حالت تندرست ہو گئی۔ گلاب وہ املا کر رہی تھی کہ اسے اس
کی بہن کے گھر میں پہنچا دیا جائے وہ وہاں نہیں رہے گی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

رہے گی۔ ایک بار وہ پٹنگ سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دو دانے کی طرف بھی جا چکی تھی۔ اگر راشد عجلت تمام سے اپنی گرفت میں نہ لیتا تو وہ سبز صیوں سے نیچے اتر جاتی۔
 انی کا فتنہ جو ناخزہ کو بیہوش دیکھ کر قہقہہ طور پر دہرایا تھا، پھر اُٹھ بھرا آیا تھا۔ وہ نیچے سے بولی:

”راشد! اسے چھوڑ آؤ اس کے گھر؟“

راشد نے ماں کو سبر سے کام لینے کی تلقین کی تو وہ، پھر گئی۔

”میں کہتی ہوں اسے چھوڑ آؤ۔“

ناخزہ نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا۔ دو دانے پر چلی گئی۔ راشد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ

پکڑ لیا۔

”دیکھو ناخزہ! عقل سے کام لو۔ راشد نے اسے آخری سیزم بھی پہنچ کر کہا۔“

”نہیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں دیوار سے سر تک ہنگ کر جان دے دوں

گی۔ کہے دیتی ہوں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں

رہوں گی۔“

راشد مجبور ہو گیا، اس نے اسے گاڑی میں ٹھایا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

انی اور آیا۔۔۔ دونوں نیچے آگئیں۔

”آیا! انی نے آیا سے مخاطب ہو کر کہا:“

آیا کھڑی رہی۔

انی کوڑک کر بولی:

”لے جاؤ اسے جہاں سے لائی ہو۔“

آیا جانے لگی۔



بھروہی کرہ، وہی کن ہیں، وہی کھڑکی اور وہی کرسی، اس دنیا سے نکل کر وہ جس دنیا

میں گئی تھی وہ اسے ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ سب کچھ کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا جیسے ایک دم بلندی سے اسے نیچے دھنکادے دیا گیا ہو۔ جیسے وہ کسی اجنبی جزیرے کی سیاحت کے بعد پھر اپنے پرانے ساحل پر اتر گئی ہو۔

اس کی بڑی بہن نامرہ اسے دیکھ دیکھ کر ٹٹھکتی رہتی تھی وہ اب اس کا ایک طرح وہاں جان بچھنے لگی تھی۔ اسے روتے ہوئے دیکھتی تھی تو کہتی تھی: "ناخرہ! تُو ہے ہی بلنصیب کوئی تیرے لئے کیا کر سکتا ہے؟ یہ تیری بد نصیبی میں بھی اسے ڈوبل ہے۔"

بہن کا یہ سلوک اس کے لئے غیر متوقع تھا تاہم وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

یہی حالت تھی جب کوکب اس گھر میں آئی۔ نامرہ گھر کے کام میں مصروف تھی اور ناخرہ اُد پر اپنے کمرے میں تھی۔

نامرہ نے کوکب کا نام مزدور سنا تھا مگر اسے دیکھا کبھی نہیں تھا اُسے اپنے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہیں۔ میرا نام کوکب ہے۔ راشد بھائی کی فود کی رشتہ دار ہوں۔"

"آئیے۔ تشریف رکھئے۔"

کوکب بیٹھ گئی۔ رسی باتوں کے بعد اس نے ناخرہ کا حال پوچھا۔ نامرہ گویا پھٹ پڑی "کیا بتائیں اس کا کیا حال ہے! مصیبت میں جان ڈال دی ہے اس نے۔ میرے لڑکے نے دہائی سے ہم دونوں کے لئے ٹکٹ بیچ دیئے ہیں۔ کاغذات بھی تیار ہیں۔۔۔ پر اس کا کیا ہے گا! پریشان ہیں۔۔۔ بلنصیب سدا کی بد نصیب ہے۔"

کوکب اُد پر چلی گئی۔

"معاف کیجئے گا! اجازت کے بغیر آپ کے کمرے میں آگئی ہوں؟"

ناخرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے اپنے اندر فخر منگی کے احساس کو

مرایت کرتے ہوئے پایا۔۔۔ اور اس احساس کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں تنکڑاؤں کو آپ نے میرا خیر خد کیا ہے۔“ کوکب نے اس کے پاس ہنگ کی پاختی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ فاختہ نے اس کے لئے لڑی خالی کر دی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔
 ”فاختہ! جو کچھ ہوا ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنوں گی، نہ کہوں گی، فقط یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب سوچا کیا ہے؟“

”کیا سوچا ہے؟“

”تباری بہن اور بہنوئی قریب رہنے والے ہیں۔ تمہیں خبر ہے؟“
 ”مجھے معلوم ہے؟“

”پھر؟“

”پھر کیا؟ زندگی اپنے سارے دوازے بند کر لے جب بھی ایک دواڑہ کھلا رہتا ہے جہاں کوئی دنگ نہیں ہے؟“

”کوکب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اپنی اس بہن کے ہوتے ہوئے تم اس دواڑے کی طرف رخ کر دو گی؟“

”جب کوئی اور راستہ دکھائی دے تو آؤ گی کیا کرے؟“

”فاختہ! سنو میری بہن! موت کا صرف ایک دواڑہ ہے۔ مگر زندگی کے بے شمار دواڑے ہیں کہیں کہیں دواڑے کو بند پاؤ گی؟“

”سب بند ہیں؟“

”تم نے کئی دواڑوں پر تو ابھی دنگ ہی نہیں دی؟“

فاختہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں کوکب اپنی ساڑھی کے پلو سے اس کے آنسو برہنجے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن میں خیال آیا، یہ عورت کون ہے! — یہ کیوں میرے آنسو پونچھ رہی ہے اسے مجھ سے کیا ہمدی ہے — کیوں ہے! وہ اپنا چہرہ مجھے

ہٹانا چاہتی تھی کہ ایک نخت اس کے ذہن میں آجائے۔ عورت جو بھی ہے سو ہے مگر اس نے اپنی طرف سے مجھے دنیا کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز دی تھی۔ یہ وہی تھی۔ وہی۔

”ساتھ کیجئے۔ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟“ فاختہ نے اس کا ہاتھ اپنی گرت میں لیے ہوئے کہا۔

”میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟ اس لئے کرتی ہوں کہ تمہاری بہن ہوں۔ تم مجھے جو کچھ سمجھنا چاہو مجھ کو بتائی ہو۔ لیکن میں تو تمہیں اپنی بہن ہی سمجھتی ہوں۔“

”شکریہ؟“

اس روز کوکب شام تک فاختہ کے پاس بیٹھی رہی اور جب جانے لگی تو وہ فاختہ کو اپنے ہمراہ اپنے یہاں جانے کے لئے رضامند کر چکی تھی۔



فاختہ نے کوکب کے عالی خان پٹیلے میں بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ اس کے شوہر کی کوششیں بھی اس کے پرانے گھر کے مقابلے میں خاصی شاندار تھیں مگر یہ ہنگامہ تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے زیادہ گھبرانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوکب اور اس کے شوہر کا دور یہ اس کے ساتھ ہمدردانہ تھا۔ کوکب اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ فاختہ خود کو ایک طائرِ نرگس تصور کرنے لگی تھی۔ وہ ہر بات کو اپنے دل سے ہمد کرتی کہ صبح اٹھ کر کہیں چلی جائے گی مگر صبح سویرے ہی کوکب اس کے لئے بیڈ لے کر آجاتی۔ آج اپنے گاڑی میں ٹھینہ کو بٹھا کر باغ میں جانے لگتی تو کوکب فاختہ کو بھی ساتھ بھیج دیتی۔ کیا کوکب کی ہدایت کے مطابق باغ میں جا کر کہیں ادھر ادھر ہو جاتی۔ فاختہ کو کوکب کی پاس تنہا رہ جاتی، بچی مدنی تو وہ اسے اٹھاتی۔

کوکب اپنی کے لئے نئے کپڑے بناتی تو فاختہ ۔ ۔ ۔ کے لئے کپڑا پسند کر لے۔

آیا تین روز کے لئے چھٹی لے کر چلی گئی تو کوکب نے ناخروہ سے کہا کہ اسے ایسے پاس ٹھال دیا کر۔

ان تین دنوں میں تیرہ زیادہ ناخروہ ہی کے پاس رہی۔

کوکب کی ان کوششوں سے ناخروہ بچی سے کسی حد تک مانوس ہو گئی۔ بچی بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جب اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر دیتی تو ناخروہ کو کچھ یوں محسوس ہوتا کہ اس کا وہ پیار جویا بیویوں کے ہجوم میں کہیں بھٹک رہا تھا۔ اس کے دل کو بہلانے لگا ہے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف تیزی سے دواں دواں تھی۔ اور وہ بچی سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتی گئی۔

○

تینہ دو روز سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

ناخروہ نے گھر کے ایک نوکر سے پوچھا:

”تینہ کہاں ہے؟“

”میں کیا جانوں بی بی! — بڑی بی بی گاڑی میں بٹھاکر لے گئی تھی۔“

”کہاں؟“

”خیر نہیں۔“

ناخروہ کوکب کے کمرے میں گئی۔

”کوکب بہن! وہ کہاں ہے — تینہ؟“

”یکوں پریشان ہو گئی ہو؟“ کوکب نے سوال کیا۔

”ہے کہاں؟“

کوکب تین لمحے خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی:

”ناخروہ! اصل میں معاملہ یہ ہے کہ اسے ایک اندرونی بیماری ہو گئی تھی — چند روز

علاج کے بعد لے آؤں گی اسے :-
 کیا ہسپتال میں ہے ؟
 وہیں اس کا علاج ہو سکتا ہے ؟

○

وہ ایک طوفانی شام تھی۔
 ناخرہ اپنے کمرے میں بنگ پر بیٹھی تھی اور کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔
 بادل زور سے گر رہا تھا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس نے کتاب اٹھانے کیلئے
 ہاتھ بڑھایا۔ اس کی نظر اس نے گھنٹی پر ٹینک کی تصویر پر پڑی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ بادل پھر گر رہا۔
 وہ بنگ سے اتر گئی۔ تصویر کے قریب گئی۔ اور قریب گئی اور ایک جذبہ بے اختیار
 اس کے دگ دپے میں سرایت کر گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ دروازے میں سے نکلی اور کوکب کے
 دروازے پر آ گئی۔

”کوکب! کوکب! آ! اس نے دروازے پر زور زور سے دنگ دیتے ہوئے کہا۔
 کوکب نے دروازہ کھول دیا۔

”وہ۔۔۔ میری ٹینک۔۔۔ وہ بھاری۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔ کوکب خدا کے لئے مجھے اس کے
 پاس لے چلو۔۔۔ مجھے لے چلو کوکب!“
 کوکب کا شور بھی وہاں آ گیا۔

”ابھی رات ہے ناخرہ! کوکب نے کہا
 ”یہ طوفانی رات۔۔۔ ابھی تو اوہ۔۔۔ مجھے لے چلو۔۔۔ میں کہتی ہوں۔۔۔“
 ”لے چلتے ہیں!“ کوکب کے شور بولے کہا

چند منٹ بعد تین گاڑیوں میں بیٹھے تھے ناخرہ نے اپنا سر گاڑی کی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے چہروں
 طرف اذہیا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کوکب گاڑی کی اور کوکب اس کا ہاتھ پکڑ کر کہیں لے گئی

ایک دم روشنی ہو گئی۔

ناخرو نے سامنے دنگ پر ٹیڈ کو سونے ہوئے دیکھا۔

میری ٹیڈ کہہ کر اس نے بچی کو گود میں اٹھالیا۔

یگاڑک اس نے اپنے سامنے ساس کو دیکھا۔ پھر اپنے شوہر کو۔ دونوں کی آنکھیں

چمک رہی تھیں اور وہ اپنے مکان کے کمرے میں تھی۔



تحریکِ آزادی فلسطین کے موضوع پر
اُردو کے تخلیقی ادب کا بھرپور اور توانا انتخاب

فلسطین اُردو ادب میں

نامور نقاد فتح محمد ملک کے تفصیلی دیباچے کے ساتھ

لکھنے والے

علامہ اقبال، ن. م. راشد، فیض، احمد ندیم قاسمی، افتخار حسین، ادا جعفری،
ابن انشا، قدرت اللہ شہاب، محمد کاظم اور دوسرے بہت سے ادیب
اور شاعر۔

شہر کے کسی بھی بکسٹال سے یا براہِ راست طلب فرمائیں

مطبوعاتِ حُرمت
بیک روڈ، راولپنڈی فون : ۶۲۰۰۰۰

مصابیح احادیث نبویؐ

- یہ اشترقانی کا احسانِ عظیم ہے کہ ہماری ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل کتابؔ مضامین قرآن مجیدؔ کی ایک بھرپور علمی و عملی مکتوب میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ مضامین قرآن مجیدؔ کے ہر باب میں بصورتِ عزت کی ایک اور عظیم کتابؔ مضامین احادیث نبویؐ کے نام سے جلد شائع ہو جائے گی۔
- مضامین احادیث نبویؐ اپنی نوعیت کی اولین اور جامع ترین کتاب ہے۔ اس میں تمام اہم مضامین کی ترتیب عرواۃً تہی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اور ایسے مضامین بھی منتخب کئے گئے ہیں جو اس کے سائنسی دور میں معاشرے کے جدید مسائل پر مشتمل ہیں۔
- احادیث کا انتخاب عام طور پر صحاح ستہ سے اور کبھی کبھار دیگر کتب احادیث سے کیا گیا ہے۔ لہذا یہ مجموعہ مستند ہے۔
- کتاب کو ایسے چاروں کے ایک ہار میں مرتب کیا ہے جو قرآن مجیدؔ کے علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ اخلاقی و فاضلہ کی ذات کے ساتھ جمہورِ مصلحت اور نفع دہکتے ہیں۔
- احادیث کا متن پیش کیا کہ بہت عزت و ترجمہ کیا گیا ہے اور یہ ترجمہ جامع اور سادہ و فہم میں ہے اس وجہ سے اس سے دینی تعلیم یافتہ افراد بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
- اس کتاب میں احادیث نبویؐ کی شاعت کے بعد مسائلِ فسیحہ کو اپنی مسائل و مضامین کو لکھنے میں اضافہ اور بڑی آسانی ہو جائے گی۔
- یہ کتاب علماء فقہاء لوگوں اور عام مسلمانوں کے لئے ایک نیا اور اہم کتاب ہے۔ اور دوسری نہایت آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس احادیث میں سے پہلے نہیں ہوئی اس لئے یہ ایک مفرد کتاب ہے۔

الحمد لله ربی! اس پر مخلص اور مسلسل سرچ کے بعد کے نتیجے میں مجھے حضرت امام کلب نامی کی یہ ایک
موجودہ خصوصیت کے کلب کے بارے میں کچھ خصوصی بات دی گئی کہ ۔۔۔ خطہ اگر بارہوی ہمارے
کوئی کتاب پر ایسا مدینہ ہے کہ اگر ہم اپنی کلب کے عزیزوں کو اس کتاب سے متواضع بنائیں تو یہی ہوگی۔
اس خصوصی بات کے حصول کے لئے آپ کو صرف اتنا ہی ہوا کہ حضرت امام کلب کے نام پر پانچ
ہزار نام اور عملی پتہ ارسال فرما دیں۔ ہمیں اپنی کتاب کا مخصوص نام دینا ۔۔۔ کیونکہ یہ ارسال کی واپسی کے اور
ساتھ ہی ایک جوابی خط بھی بھیج دیا کریں گے۔ اگر آپ صبر کریں گے تو دوبارہ کتاب آپ کی واپسی کے دفتر کی
فائبر پر کی نوبت کی منتظر ہے یا خداوند ہر شے کے لئے آپ کو اپنی کتاب کی کتب میں بھیجیں گے تو
بروز صبر کر لیں یہی جوابی خط کے ذریعے مطلع فرما دیں۔ اگر آپ کتاب طلبہ یا چاہی تو یہی فیصلہ خصوصی بات کے
کے ساتھ کتاب آپ کو ذرا دیر رہے گی۔ آمین

- خدمتِ ملک و قوم کا دل چاہنے کے لئے کوئی ایسی کیفیت نہیں۔
- ہر کتاب کا مختصر خلاصہ آپ کا خدمتِ بیجا ہوا ہے گا۔
- آپ کے جواب کے لئے آپ کا جوابی کارڈ ہم ارسال کیا کریں گے۔
- کتاب کو پڑھ لیں، اسے دیکھ لیں اور دوسرے اطراف سے ہم برداشت کیا کریں گے۔
- ہر کتاب میں فیصد خصوصی عبارت۔

ہنگامہ نگاروں، نوآموزان، مسوئلوں سے ملنا، اچھا آپ کے اپنے مفاد میں ہے۔

انچارج، حرمت بک کلب۔ منظومات حرمت۔ جنگ روڈ۔ راولپنڈی

ہماری متفرّد کتابیں

مضامین قرآن مجید	زاد تک	۱۵۰ روپے
علامہ صاحب قرآن	بشریہ کتب خانہ لاہور	۳۰ روپے
جرم و معزاکہ اسلامی فلسفہ	بشریہ کتب خانہ لاہور	۳۰ روپے
قرآن ایک نظریں	مرزا محمد بیاض صریحی	۲۰ روپے
قرآن اور ادیب	زاد تک	۳۰ روپے
اسلامی حدود و تعزیرات	ڈاکٹر عبدالحق صاحب	۵۰ روپے
خطبات رسولؐ	پروفیسر رحمت اللہ علیہ	۲۵ روپے
ملاقیہ رسولؐ	عزیز تک	۳۰ روپے
امالیہ رسولؐ	عزیز تک	۲۰ روپے
بہ حضرت دوست	مولوی محمد سعید	۳۵ روپے
پہلے - ایک مطالعہ	کرمی قلام سرور	۳۰ روپے
مسافر جرم	کرمی قلام سرور	۳۵ روپے
حرفِ حرف روشنی خزانہ کرمی قلام سرور		۳۵ روپے
مفتوحہ نعیمیہ - ۱۵۰۱ - ۱۵۰۲	آبش صریحی	۳۵ روپے
مفتوحہ افسانے - ۱۵۰۱	فتح محمد کرمی قلام سرور	۳۰ روپے
مشہد تاریخی	زاد تک	۳۵ روپے
مفتوحہ غزالیہ - ۱۵۰۱	ناصر علی	۳۵ روپے
مفتوحہ افسانے - ۱۵۰۱	فتح محمد کرمی قلام سرور	۳۰ روپے

افسانوی ادب

- منتخب لڑائی ہے۔ بابا زریں جی کوکب اہلستان ۴۰ ۲۰ روپے
○ منتخب لڑائی ہے۔ زریں جی کوکب اہلستان ۳۵ ۲۰ روپے
○ منتخب لڑائی ہے۔ دریا ڈاک کوکب اہلستان ۳۰ ۲۰ روپے
○ زریں جی پستھل مستر ۳۰ ۲۰ روپے
○ ستاروں پران برص ۳۰ ۲۰ روپے
○ طواغیر کا کوکب ۳۰ ۲۰ روپے

طنز و مزاح

- شہت تازی دیکھ ۲۵ ۲۰ روپے
○ طنز و مزاح ہے۔ زریں جی کوکب ۲۵ ۲۰ روپے
○ تاسکیل ط برص ۲۵ ۲۰ روپے

سفرنامہ

- سفرنامہ طبرستان کی تمام سرحد ۲۵ ۲۰ روپے

تنقید و تحقیق

- تحقیق و تفسیر لکھنؤ ۳۰ ۲۰ روپے
○ پیریں ایک ماحول لکھنؤ ۳۰ ۲۰ روپے

سیاسیات

○ PAKISTAN AND THE ARAB
COLLECTIVE SECURITY SYSTEM
JUDAH AZAM
Rs. 40/-

○ MYRANISTAN-SOME ASPECTS
S. MITZA HUSAIN

○ STUDIES IN POLITICAL STRATEGIES
S. MITZA HUSAIN

دیہیے کتب

- مثنوی قرآن مجید ۱۰۰ ۲۰ روپے
○ خواجہ صاحب قرآن مثنوی ۳۰ ۲۰ روپے
○ قرآن ایک نظریں ۱۰۰ ۲۰ روپے
○ قرآن اور ادب ۳۰ ۲۰ روپے
○ اسلامی حدود و قوانین ۵۰ ۲۰ روپے
○ شخصیات و مشاہیر ۲۵ ۲۰ روپے
○ مکتبہ و مشاہیر ۲۰ ۲۰ روپے
○ ہلالِ صحابہ ۳۰ ۲۰ روپے
○ آدم و حوا اور اسلامی فلسفہ ۳۰ ۲۰ روپے
○ اسلامی نظامِ عدالت ۲۵ ۲۰ روپے
○ طواغیر و تاریخی واقعات ۳۰ ۲۰ روپے

نعتیہ مجموعے

- نعت و نعتیہ لکھنؤ ۲۵ ۲۰ روپے
○ مجموعہ سب دیکھ ۱۵ ۲۰ روپے
○ منتخب نعتیہ لکھنؤ ۲۵ ۲۰ روپے

قومی مشاہیر

- قاضی اعظم اسلامی کراچی ۳۰ ۲۰ روپے
○ آبدانِ اخوندی لکھنؤ ۳۰ ۲۰ روپے

شاعری

- منتخب غزلیں ۲۵ ۲۰ روپے
○ منتخب غزلیں ۲۵ ۲۰ روپے
○ منتخب غزلیں ۲۵ ۲۰ روپے
○ منتخب غزلیں ۲۵ ۲۰ روپے